فہرست

شذرات	اس روز دنیا دیکھے گی	ریحان احمد یوسفی	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۶۴-۷۱)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی	بو والی سبزیاں کھا کر مجالس میں آنے سے متعلق ایک رخصت	معز امجد	۱۱
	نماز کے اوقات ـــــ حدیث ۷	ساجد حمید	۱۵
دین و دانش	اخلاقیات (۴)	جاوید احمد غامدی	۲۳
	اسلام اور مصوری ـــــ جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر (۴)	منظور الحسن	۳۱
نقطۂ نظر	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟ (۶)	ساجد حمید	۴۵

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

اس روز دنیا دیکھے گی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باسی ہیں۔وہ پاکستان جسے اسلام کے نام پر بنایا گیا۔وہ پاکستان جس کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔وہ پاکستان جس کے آئین میں طے ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔وہ پاکستان جسے اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے۔وہ پاکستان جس کے باشندوں کو اپنی اسلامی تاریخ اور پس منظر پر بے حد فخر ہے۔انھیں فخر ہونا بھی چاہیے۔اس لیے کہ خلافت راشدہ تو ایک طرف ملوک وسلاطین تک بھی جب کوئی کمزور نسوانی پکار پہنچتی تو بنوامیہ اور بنوعباس کے پایۂ تخت پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔حجاج اور معتصم جیسے غیر آئینی حکمران جب تک اس پکار کا جواب نہ دے لیتے چین سے نہ بیٹھتے۔

آج اسلام کے اس قلعے؛مملکت خداداد پاکستان میں ملتان کی دیہاتی مختاراں سے لے کر سوئی کی ڈاکٹر شازیہ جیسی اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ خاتون ایک جیسی صدا بلند کرتی ہیں۔دیہات کی پنچایت کے زیر سایہ اور ایک بڑے ادارے کی زیر ملازمت،وحشی درندوں کے ہاتھوں اپنی عصمت کی بربادی کا ماتم کرتی یہ خواتین انصاف کی دہائی نہیں دے رہیں۔یہ اپنا مقدمہ اپنے رب کے حضور پیش کرتی ہیں۔اس لیے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ دنیا میں انصاف کی امید ان کے لیے دم توڑتی جارہی ہے۔ہم نے کراچی کی آسیہ کا نام اس لیے نہیں لیا کہ اپنی ہوس کی آگ سے اسے جھلسانے کے بعد ظالموں نے تیل چھڑک کر اسے زندہ جلا دیا۔اس کا بستر مرگ پر بیان بھی اسے انصاف نہ دلا سکا اور یہ گھریلو ملازمہ انصاف کی تلاش میں اس رب کے حضور پہنچ گئی جس کی عدالت انصاف کے لیے محتاج ثبوت ہے نہ کوئی مجرم کسی فدیہ اور ضمانت ہی پر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا سکے گا۔ان خواتین کے ساتھ کیا گزری،انتظامیہ نے

کیا کارروائی کی، عدالتوں میں کیا ہوا، ہم اس کی تفصیل میں اس لیے نہیں جارہے کہ میڈیا پر اس کی تفصیلی رپورٹ آچکی ہے اور ملک کے سارے باشعور لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ خواتین انصاف پاسکیں گی یا وقت کی بھول بھلیاں میں ان کی داستانیں بھی لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائیں گی۔ سردست ہم اپنے قارئین کے سامنے کچھ ایسے نکات رکھ رہے ہیں جو ان خواتین کے ساتھ رونما ہونے والے سانحات سے واضح ہو کر سامنے آئے ہیں۔

ان خواتین کا یہ حال اس طرح نہیں ہوا کہ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ تھا۔ میڈیا کی پوری طاقت، قوم کی پوری ہمدردی اور ایوان اقتدار کے مکینوں کی یقین دہانیاں پوری طرح ان کے ساتھ ہیں، مگر مہینوں گزر جانے کے بعد بھی انھیں انصاف نہ مل سکا۔ ان کے معاملات سے صاف ظاہر ہے کہ اس ملک میں ظلم کرنے والا اگر طاقت ور ہے تو وہ انسانیت کے خلاف بدترین جرائم کا ارتکاب کر کے بھی قانون کی گرفت سے صاف نکل سکتا ہے۔ وہ اپنے حق میں ہر قسم کی گواہی پیش کر سکتا ہے۔ وہ عدالتی نظام کے نقائص سے فائدہ اٹھا کر قانون کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو وہ اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر انصاف میں اتنی تاخیر کر سکتا ہے کہ Justice Delayed, Justice Denied کے مصداق انصاف ہی غیر مؤثر ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر انصاف پانے کا یہ عمل اتنا مشکل اور مہنگا ہے کہ عوام الناس کسی عدالت میں جا کر مقدمہ لڑنے کا سوچ ہی نہیں سکتے۔ وکلا کی بھاری فیس، مقدمات کی طوالت، فکر معاش کی مشغولیات وہ مسائل ہیں جن کے سامنے آتے ہی غریب اپنے ہر مقدمہ کو رب کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ جو کھو چکا ہے، اسی کو کافی سمجھتا ہے اور مزید کھونے کی سکت نہ ہونے کی بنا پر ہر ظلم تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

ہمارے پس منظر میں ظلم اگر آبرو کے خلاف ہوا ہو تو اس کی شناعت جان و مال کے خلاف کیے جانے والے اقدام سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، مگر ہماری سوچ اور رویے ان معاملات میں ہمدردانہ کم اور ظالمانہ زیادہ ہیں۔ ایسی مظلوم خواتین کو جس طرح جگ ہنسائی کا نشانہ بننا پڑتا ہے، وہ خود اپنی جگہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ انھیں معاشرتی اچھوت بنانے سے لے کر کاری کرنے تک ہمارے وہ معاشرتی رویے ہیں جو ایسی مظلوم خواتین اور ان کے لواحقین کو اس ظلم عظیم کے بیان کرنے سے بھی روک دیتے ہیں، کجا یہ کہ وہ کسی انصاف کی توقع کریں۔

اس طرح کے واقعات سے ہماری یہ قومی نفسیات بھی سامنے آتی ہے کہ ہم کسی مسئلے کے سامنے آنے پر کچھ شور و غوغا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ رات گئی بات گئی کی نفسیات کا شکار ہماری قوم ایسے واقعات کے اسباب اور ان کے سدباب کے لیے کوئی جامع منصوبہ بندی نہیں کرتی۔ اس کا بھی سبب ہے۔ وہ یہ کہ ہماری قوم کی فکری قیادت، جس کی

یہ اصلاً ذمہ داری ہے، وہ انھیں کچھ اور لوریاں سنانے میں مشغول رکھے ہوئے ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ مذہب بے زار اور سیکولرازم کے دل دادہ ہیں اور کچھ لوگ ماضی کی عظمت کے گیت گانے اور اسے دوبارہ لانے کی نوید دینے والے مذہبی لوگ ہیں۔ پہلا گروہ تو عوام میں زیادہ مؤثر نہیں ہے، مگر دوسرا ماضی پرست گروہ جو حال سے بے پروا ہے، مستقبل میں اگر کچھ دیکھتا اور دیکھ سکتا ہے تو کسی آنے والے کو دیکھتا ہے جو آ کر جادو کی ایک چھڑی گھمائے گا، جس کے بعد دنیا امن و آشتی سے بھر جائے گی۔ ہم اس جذباتی قیادت کو اس کے حال پر چھوڑ کر مسئلہ کے حل کی طرف آتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مسئلہ کا حل 'عدالتی اور معاشرتی نظام ٹھیک کرو' کا نعرہ نہیں، بلکہ اخلاقی اقدار اور اصولوں کی پابندی کو اس قوم کا بنیادی مسئلہ بنانا ہے۔ یہی ہمارا وہ اصل مسئلہ ہے جو عدالت اور معاشرت میں نہیں، بلکہ زندگی کے ہر ہر میدان میں ہمارے لیے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنا ہوا ہے۔ کیونکہ ہر نظام انسان چلاتے ہیں۔ انسان کی اخلاقی حس اگر زندہ نہ رہے تو اچھے سے اچھا نظام بھی مفید و موثر نہیں رہتا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اخلاقی طور پر دن بدن بے حس ہوتے جا رہے ہیں اور کسی کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں آتی۔ یہ کسی ایک گروہ کا مسئلہ نہیں، بلکہ ہر طبقہ کا مسئلہ ہے۔ استاد، طالب علم، صحافی، تاجر، مزدور، فوجی، سیاست دان، عالم، غرض زندگی کے ہر شعبہ کا آدمی اپنے اپنے مقام پر اخلاقی اقدار کی خلاف ورزی کو معمول بنا چکا ہے۔ ہم اخلاقی طور پر اگر حساس ہیں تو دوسروں کے معاملے میں۔ اپنا معاملہ ہو تو اصل چیز اپنا مفاد بن جاتی ہے۔ یہ رویہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

ایسا نہیں ہے کہ اصلاح کا علم بردار کوئی بھی گروہ اس اخلاقی انحطاط پر خوش ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ ہمارے ہاں بنیادی مسئلہ نہیں بن سکا۔ اس لیے دوسرے لوگ ہی نہیں خود مصلحین بھی جہاں موقع ملتا ہے اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل متعین ہے کہ اخلاقی اقدار کو قوم کا مسئلہ بنانا اصلاح احوال کی بنیادی اینٹ ہے۔ جب ہم اخلاقی معاملات میں حساس ہوں گے تو زندگی کے ہر گوشہ میں اس کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اخلاقی اصلاح کی یہ دعوت اس قوم کے لیے کوئی اجنبی دعوت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین، بلکہ ہر نبی کی دعوت، اصل میں ایمان و اخلاق ہی کی دعوت ہے۔ جسے اس بارے میں شک ہو، وہ قرآن کی مکی سورتوں کو پڑھ لے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔

رہا شازیہ، آسیہ اور مختاراں کا معاملہ تو انھیں نوید ہو۔ انھوں نے جس خدا کے نام کی دہائی دی ہے، وہ شاید اس سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی ہیبت، جبروت، قدرت، طاقت، عظمت اور اقتدار آج پردۂ غیب میں مستور ہے۔ اسی لیے ظالم اس سے بے خوف ہو جاتے ہیں، لیکن جلد اور بہت ہی جلد وہ دن آ رہا ہے جب زمین کے ہر بادشاہ، ہر طاقت ور، ہر جبار اور ہر ظالم کی قوت، شوکت، دولت اور عظمت کو قیامت کا زلزلہ تہس نہس کر دے گا۔ خداوند کے ظہور کا وہ دن بدلہ کا دن ہو گا۔ اس روز سب جان لیں گے کہ وہ ظالموں کو عبرت ناک سزا دینے کی طاقت بھی رکھتا ہے اور مظلوموں کے دل کی ہر پھانس نکال لینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ جس روز وہ ظالموں کو سزا دے گا، اس روز دنیا دیکھے گی۔ جس روز وہ مظلوموں کے دلوں کی پھانس نکال کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے گا، اس روز دنیا دیکھے گی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

قُلْ: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ، تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ، اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ، وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا، وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فَاِنْ

(اِن سے) کہہ دو، اے اہل کتاب[۱۲۲]، اُس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے[۱۲۳]۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے

[۱۲۲] یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن پیچھے کے مضمون سے واضح ہے کہ روے سخن نصاریٰ کی طرف زیادہ ہے۔

[۱۲۳] قرآن نے یہ دعوت ٹھیک اس طریقے کے مطابق دی ہے جس کی تلقین اس نے خود فرمائی ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلانا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجایش تھی، بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا: اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ، لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ، وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْ بَعْدِهٖ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ، فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا

کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔[124] پھر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔[125] ۶۴

اے اہل کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، دراں حالیکہ تورات و انجیل تو اس کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟[126] یہ تمھی لوگ ہو کہ اُن باتوں میں تو جھگڑ چکے جن کے بارے میں تمھیں کچھ علم تھا، مگر اب یہ اُس بات میں کیوں جھگڑ رہے ہو جس کا تمھیں کچھ بھی علم نہیں ہے۔ اور

تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے انھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کر کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مسلم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھیرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھیرائے، پھر اس مسلم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں صوفیوں کو 'ارباباً من دون اللّٰہ' کا درجہ کیوں دے دیا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۱۲)

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

[۱۲۴] یعنی اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جو باتیں محض بدعات و متشابہات کی پیروی میں عقیدہ بنا لی گئی ہیں، انھیں چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کریں جس کی تعلیم تمام انبیا علیہم السلام نے دی ہے۔ یہاں خاص طور پر یہ بات جو آئی ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنائے، اس سے اشارہ تحلیل و تحریم کے ان اختیارات کی طرف ہے جو اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو دے رکھے تھے۔ اس لیے کہ کسی کو اپنی ذات میں شارع و حاکم سمجھ کر اس کی اطاعت بھی درحقیقت اس کی عبادت ہی ہے۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پر وضاحت فرمائی ہے کہ یہ انھیں رب بنا دینا ہے۔

[۱۲۵] یہ اظہار برأت کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس بات کے گواہ رہو کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور تمھیں بتا دیا کہ اسلام کی حقیقت یہی توحید ہے۔ اس سے محرومی کے بعد کسی شخص کو خدا حاصل نہیں ہو سکتا۔

[۱۲۶] یہود و نصاریٰ اور مشرکین، تینوں ہی اپنی گمراہیوں کی حمایت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا نام استعمال کرنے کی

تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا، وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ، وَهٰذَا النَّبِيُّ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾

(حقیقت یہ ہے کہ اِن سب حقائق کو) اللہ جانتا ہے، مگر تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ ایک مسلم حنیف تھا[127] اور وہ اِن مشرکوں میں سے بھی نہیں تھا[128]۔ ابراہیم کے ساتھ نسبت کا زیادہ حق اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اُس کی پیروی کی۔ پھر یہ پیغمبر (اِس کے حق دار) ہیں اور جو اِن پر ایمان لائے اور اللہ تو اِنھی ایمان والوں کا ساتھی ہے[129]۔ ۶۵۔۶۸

کوشش کرتے تھے۔ یہ قرآن نے ان کے اس جھگڑے کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ ابراہیم ہمارے طریقے پر تھے، دراں حالیکہ تورات اور انجیل، دونوں ان کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ فرمایا ہے کہ حق کی عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی سی بات بھی ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

[۱۲۷] یعنی اپنے پروردگار کے فرماں بردار اور پوری یک سوئی کے ساتھ توحید کی راہ پر گامزن تھے۔ اس سے ہٹ کر کج پیچ کے یہ مشرکانہ راستے انھوں نے کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔

[۱۲۸] یعنی ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہ تھا، اسی طرح بنی اسمٰعیل کے ان مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسمٰعیل کی تردید میں ہے جو اس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس لیے تھی کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گمراہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین ان کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے، بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں، یہ دین ان کو حضرت ابراہیم ہی سے وراثت میں ملا ہے۔'' (تدبرقرآن ۲/۱۱۵)

[۱۲۹] یعنی ساتھی ہے تو یقیناً ان کی مدد بھی کرے گا اور ان کے مخالفوں پر انھیں غلبہ بھی عطا فرمائے گا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْيُضِلُّوْنَكُمْ، وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ، وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ، لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ، وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ، لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ، وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

(ایمان والو)، اِن اہل کتاب کے ایک گروہ کی تمنا ہے کہ کسی طرح تمھیں صحیح راستے سے ہٹا دے۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح) وہ اپنے آپ ہی کو گمراہی میں ڈال رہے ہیں، مگر نہیں سمجھتے۔ اے اہل کتاب، تم اللہ کی آیتوں کے منکر کیوں ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم اُن کے گواہ ہو؟[۱۳۰] اے اہل کتاب[۱۳۱]، تم حق کو باطل میں کیوں ملاتے ہو اور کیوں حق کو چھپاتے ہو، دراں حالیکہ تم جانتے ہو؟[۱۳۲] ۶۹۔۷۱

---

[۱۳۰] یعنی ان میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں، انھیں تم پہلے سے جانتے ہو اور دنیا کے آگے ان کی شہادت دینے کا اقرار کر چکے ہو۔

[۱۳۱] یہ تکرار اظہار حسرت و ملامت کے لیے ہے کہ افسوس، تم اہل کتاب ہو کر لوگوں کو اس طرح گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

[۱۳۲] یہ اشارہ ہے ان تحریفات کی طرف جو ان لوگوں نے بیت الحرام سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی روایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں میں کی تھیں۔ آیت میں 'وانتم تعلمون' کے الفاظ سے واضح ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں یہود کے علما ان تحریفات سے پوری طرح واقف تھے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معز امجد

بو والی سبزیاں کھا کر مجالس میں آنے سے متعلق ایک رخصت

قال مغيرة بن شعبة رضى الله عنه: أكلت ثوما فأتيت مصلى النبى صلى الله عليه وسلم وقد سبقت بركعة فلما دخلت المسجد وجد النبى صلى الله عليه وسلم ريح الثوم. فلما قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاته قال: من أكل من هذه الشجرة فلا يقربنا حتى يذهب ريحها. فلما قضيت الصلاة جئت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت يا رسول الله والله لتعطينى يدك. قال: فأدخلت يده فى كم قميصى إلى صدرى فإذا أنا معصوب الصدر. قال: إن لك عذرا.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (ایک مرتبہ) میں لہسن کھانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی جگہ پر اس وقت پہنچا جب ایک رکعت گزر چکی تھی۔ جونہی میں مسجد میں داخل ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن کی بو محسوس کر لی۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی تو فرمایا: جو یہ سبزی کھائے، اسے چاہیے کہ اس کی بو ختم ہونے تک ہمارے قریب نہ آئے۔ اپنی نماز مکمل کرنے کے بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا: اے اللہ کے

رسول، خدا کے لیے آپ اپنا ہاتھ مجھے دیجیے (تاکہ میں آپ کو لہسن کھانے کی وجہ بتا سکوں)۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اپنی قمیض کے نیچے سینے کی طرف داخل کیا تو میرا سینہ بندھا ہوا تھا۔ (یہ محسوس کرتے ہی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں تمھارے پاس (لہسن کھا کر مسجد میں آنے کا) عذر ہے[1]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اپنا سینہ اور پیٹ بھوک کی شدت کو برداشت کرنے کے لیے باندھ رکھا تھا اور یہ صورت حال محسوس کرتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا لہسن کھا کر مسجد میں آنے کا عذر قبول کر لیا۔

متن کے حواشی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ یہ ابوداؤد کی روایت، رقم ۳۸۲۶ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۰۱، ۱۸۲۳۰۔ بیہقی، رقم ۴۸۴۰۔ ابن حبان، رقم ۲۰۹۵۔ ابن خزیمہ، رقم ۱۶۷۲۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۸۶۵۶، ۲۴۴۸۶۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۸۴۰ میں 'أکلت ثوما' (میں نے کچھ لہسن کھایا) کے بجائے 'اکلت الثوم علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' (میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لہسن کھایا) کے الفاظ روایت ہوے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۳۰ میں 'وقد سبقت برکعة' (ایک رکعت گزر چکی تھی) کے بجائے 'قد سبقنی برکعة' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت مجھ سے آگے تھے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ ابن حبان، رقم ۲۰۹۵ میں 'فوجدته قد سبقنی برکعة' (میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں پایا کہ آپ ایک رکعت مجھ سے آگے تھے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'فلما دخلت المسجد' (جب میں مسجد میں داخل ہوا) کی جگہ 'فدخلت معھم فی الصلاة' (چنانچہ میں ان کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا) کے الفاظ روایت ہوے ہیں۔

احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۳۰ میں 'فلما دخلت المسجد وجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ریح الثوم'

(جب میں مسجد میں داخل ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن کی بو محسوس کی) کے بجائے 'فلما صلی قمت أقضي فوجد ريح الثوم' (جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے اور میں اپنی نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو آپ نے لہسن کی بو محسوس کی) کا مضمون نقل ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۳۰ میں 'من أكل من هذه الشجرة' (جو اس درخت میں سے کھائے) کے بجائے 'من أكل هذه البقلة' (جو یہ پودا کھائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'من أكل من هذه الشجرة الخبيثة' (جو اس مکروہ درخت میں سے کھائے) کے الفاظ اور ابن حبان، رقم ۲۰۹۵ میں 'من أكل من هذه البقلة' (جو اس پودے میں سے کھائے) کے الفاظ نقل ہوے ہیں۔

احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۳۰ میں 'فلا يقربنا' (تو اسے ہمارے قریب نہیں آنا چاہیے) کے بجائے 'فلا يقربن مسجدنا' (اسے ہماری مسجد کے قریب نہیں آنا چاہیے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'فلا يقربن مصلانا' (تو اسے ہماری نماز کی جگہ کے قریب نہیں آنا چاہیے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

ابوداؤد، رقم ۳۸۲۶ میں 'ريحها' (اس کی بو) کے بجائے 'ريحه' (اس کی بو) بھی روایت ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'فلما قضيت الصلاة' (تو جب میں نے اپنی نماز پڑھ لی) کے بجائے 'فأتممت صلاتي فسلمت' (تو میں نے اپنی نماز مکمل کر لی اور سلام پھیر دیا) کے الفاظ نقل ہوے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'والله لتعطيني يدك' (خدا کے لیے آپ مجھے اپنا ہاتھ دیجیے) کے بجائے 'أقسمت عليك لما أعطيتني يدك' (میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا ہاتھ دیجیے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۲۰۹۵ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مکالمہ یوں نقل ہوا ہے 'يا رسول الله إن لي عذرا. فناولني يدك فناولني فوجدته والله سهلا فأدخلتها في كمي إلى صدري' (اے اللہ کے رسول، بے شک میرے پاس ایسا کرنے کی وجہ ہے۔ آپ اپنا ہاتھ مجھے دیجیے تا کہ میں آپ کو یہ وجہ دکھا سکوں۔ چنانچہ آپ نے اپنا ہاتھ مجھے دیا، خدا کی قسم وہ انتہائی نرم تھا، اور میں نے اسے اپنی قمیض میں اپنے سینے کی طرف داخل کیا)۔

احمد بن حنبل، رقم ۱۸۲۳۰ میں 'فإذا أنا معصوب الصدر' (تو میرا سینہ بندھا ہوا تھا) کے بجائے 'فوجده معصوبا' (تو آپ نے اسے بندھا ہوا پایا) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۴۸۴۰ میں 'إن لك عذرا' (بے شک تمھارے پاس ایسا کرنے کی وجہ ہے) کے بجائے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

'أری لك عذرا' (میں دیکھتا ہوں کہ تمھارے پاس اس کا جواز ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شرح موطا

ساجد حمید

نماز کے اوقات

حضرت عمر کا خط

[۷] وحدثنی عن مالك عن عمه ابی سهیل عن ابیه ان عمر بن الخطاب کتب الی ابی موسی:

اَنْ صَلِّ الظُّهْرَ اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ بَیْضَاءُ نَقِیَّةٌ قَبْلَ اَنْ یَدْخُلَهَا صُفْرَةٌ وَالْمَغْرِبَ اِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ وَاَخِّرِ الْعِشَاءَ مَا لَمْ تَنَمْ وَصَلِّ الصُّبْحَ وَالنُّجُوْمُ بَادِیَةٌ مُشْتَبِكَةٌ وَاقْرَأْ فِیْهَا بِسُوْرَتَیْنِ طَوِیْلَتَیْنِ مِنَ الْمُفَصَّلِ.

عمر بن الخطاب نے ابو موسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ:

''ظہر پڑھو، جب سورج نصف النہار سے جھکے، اور عصر پڑھو، جب سورج ابھی سفید روشن ہو، زرد نہ ہوا ہو، مغرب سورج ڈوبتے ہی پڑھو، اور عشا کو اپنے سونے تک موخر کرو، صبح اس وقت پڑھو، جب ابھی ستارے خوب روشن اور باہم گتھم گتھا ہوں، فجر کی نماز میں مفصلات میں سے دو لمبی سورتیں پڑھا کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۸] وحدثنی عن مالك عن هشام بن عروة عن ابيه:ان عمر بن الخطاب كتب الی ابی موسی الاشعری ان:

صَلِّ الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ قَدْرَ مَا يَسِيرُ الرَّاكِبُ ثَلاَثَةَ فَرَاسِخَ وَاَنْ صَلِّ الْعِشَاءَ مَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ ثُلُثِ اللَّيْلِ فَاِنْ اَخَّرْتَ فَاِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ، وَلاَ تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ.

عمر بن الخطاب نے ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ:

''عصر اس وقت پڑھو، جب ابھی سورج روشن ہو اور زرد نہ ہوا ہو، (غروب سے) اتنا پہلے کہ ایک مسافر تین فرسخ فاصلہ طے کر سکے، اور عشا کو اپنے اور ایک تہائی رات کے درمیان میں پڑھ لو، اور اگر تاخیر کرنا چاہو تو بس آدھی رات تک، اور (نماز میں تاخیر کر کے) غافلوں میں سے نہ بنو۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شرح

مفہوم و مدعا

یہ دو روایتیں ہیں، ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابوموسیٰ اشعری کے نام خط کا مضمون بیان ہوا ہے۔ دونوں میں خط کا مضمون ایک سا ہی ہے۔ ان میں اور ان سے پہلی روایت میں مذکور عمال کے نام خط کے مضمون میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ نمازوں کے اوقات ایک جیسے ہی ہیں۔

دوسرے خط میں عشا کو نصف رات تک موخر کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس لیے کہ اس کا آخری وقت سنت میں یہی مقرر کیا گیا ہے۔

اوقات کی تفصیل وہی ہے جو پچھلی روایتوں میں پسندیدہ اوقات کی چلی آ رہی ہے۔ اس لیے یہاں ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

لغوی مسائل

المفصل: ہر وہ چیز جس کو اس طرح سے بنایا گیا ہو کہ اس کے اجزا ٹکڑیوں کی صورت میں الگ الگ دکھائی دیں،

جیسے جڑاؤ ہار۔قرآن مجید کی آخری سورتیں چونکہ بہت زیادہ اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں ہیں اور بار بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نگینوں کا جڑاؤ دکھائی دیتا ہے، اس لیے قرآن کا یہ حصہ مفصل کہلاتا ہے۔قرآن کے اس حصے کی سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ سورۂ حجرات سے اختتام تک مختلف حصوں پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔حضرت عمر کی مراد یہ ہے کہ فجر میں سورۂ حجرات سے آگے کے قرآن میں سے کوئی لمبی سورتیں تلاوت کیا کرو۔

اس خط میں ’ ثلاثة فراسخ ‘ ہے، جبکہ عمال کے نام خط میں جو پیچھے گزرا ’ فرسخين أو ثلاثة ‘ اندازہ سا بتانے کے لیے ہے۔ میرے خیال میں اس خط میں بھی یہ تحدید کے لیے نہیں ، بلکہ اندازے وتخمین ہی کے لیے ہے۔اور دوسرے خطوط کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خط میں بھی دراصل ’فرسخين او ثلاثة ‘ ہی کہنا پیش نظر تھا۔راویوں نے اس میں حذف واسقاط سے کام لیا ہے۔

مابينك و بين ثلث الليل : اس سے مراد دو باتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ’مابين وقتك و بين ثلث الليل ‘ یعنی جو تمھارا معمول کا وقت ہے، جس پر تم نماز پڑھتے ہو، اس سے لے کر ایک تہائی رات تک، اور دوسرے یہ معنی ہو سکتے ہیں ’مابين دخولك العشاء و بين ثلث الليل ‘ کہ تیرے عشا کے وقت میں داخل ہونے سے لے کر تہائی رات تک ۔ یہی دوسرے معنی موقع ومحل کے لحاظ سے درست ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

درایت

یہ روایت بھی سیدنا عمر کا اثر ہے۔عمال کے نام ان کے خط میں اور اس میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے قرآن وسنت کے ساتھ اس کے تعلق کی وضاحت پچھلی روایت کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

دیگر طرق

عن ابی العالية الرياحی ان عمر بن الخطاب كتب الی ابی موسی : ان صل الظهر اذا زالت الشمس عن بطن السماء وصل العصر اذا تصوبت الشمس وهی بيضاء نقية وصل المغرب اذا وجبت الشمس وصل العشاء اذا غاب الشفق

’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ ظہر سورج کے آسمان کے وسط سے نیچے آنے پر پڑھو، اور عصر اس وقت پڑھو ، جب سورج نیچے آجائے، لیکن وہ سفید روشن ہو۔مغرب سورج کے ڈوبنے پر پڑھو، اور عشا شفق کے غائب ہونے سے لے کر جتنی تاخیر سے چاہے پڑھو، کہا جاتا تھا:’’ آدھی رات تک عشا کو پانے کا وقت

الی حین شئت فکان یقال: الی نصف اللیل درك وما بعد ذلك افراط . وصل الصبح والنجوم بادیة مشتبکة واطل القراء ة واعلم ان جمعا بین الصلاتین من غیر عذر من الکبائر .

(مصنف عبدالرزاق، رقم ۲۰۳۵)

ہے، اس کے بعد پڑھنا تو نماز کو چھوڑ نا ہے''۔ فجر اس وقت پڑھو جب ستارے روشن اور گھنے ہوں، اور اس میں قرأت لمبی کیا کرو۔ اور یاد رکھو نمازوں کو بلا عذر جمع کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔''

مصنف عبدالرزاق کی اس روایت میں وقت عصر کے لیے' تصوبت الشمس ' کے الفاظ آئے ہیں۔ جو اس بات کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ وہ وقت مراد ہے جب سورج نیچے آ جاتا ہے۔ یہ وہی وقت ہے جسے ہم نے اس باب کی پہلی روایت کے تحت سورج کے مرای العین پر آنے کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جب سورج اتنا نیچے آ جائے کہ ہم سر اٹھائے بغیر اسے دیکھ سکیں۔

موطا کی ان دونوں روایتوں میں یہ فرق ہے کہ پہلی روایت میں تمام نمازوں کا ذکر ہے، جبکہ دوسرے خط میں صرف عصر اور عشا کا۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ممکن ہے کہ سیدنا عمر کو معلوم ہوا ہو کہ عمال عصر اور عشا میں کچھ کوتاہی کر رہے ہیں تو انھوں نے ان دونوں نمازوں کے لیے الگ سے تنبیہ کے لیے ایک خط لکھا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک ہی خط ہو، مگر عروہ نے کسی موقع پر صرف عصر اور عشا والے حصہ ہی کو بیان کیا ہو اور باقی حصہ کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے بیان نہ کیا ہو وغیرہ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

احادیث باب پر نظر

اس اثر میں عشا کی تاخیر کا مشورہ دیا گیا ہے۔ آگے ابو برزہ کی جو روایت آ رہی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ عشا کے ایک تہائی رات تک موخر کرنے کے عمل کو ایسا عموم حاصل تھا کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں اس وقت کی عشا کا نام ' عتمة ' الگ سے پڑ گیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشا میں تاخیر ایک عمومی عمل تھا جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تاخیر پسندیدہ ہے۔

یہاں بظاہر سبقت الی الخیر کے اصول کے خلاف نماز کی تاخیر کو پسند کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ایسا نہیں ہے۔ امامت جبریل والی روایت میں پسندیدہ وقت میں آخری وقت ایک تہائی رات ہی بتایا گیا ہے۔ اس لیے اس وقت تک تاخیر پسندیدہ اوقات کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں، البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے پسندیدہ وقت کے آخر

تک کیوں موخر کیا گیا ہے؟

ہم امامت جبریل والی روایت (رقم ۱) میں یہ بات لکھ آئے ہیں کہ کسی چیز کی فضیلت وانتخاب شارع کے کسی فرمان سے بھی نکلتی ہے، جیسے جمعہ کے دن کی فضیلت، یا حج کے لیے ذوالحج کا انتخاب اور کبھی یہ فضیلت شارع کے کسی بیان کردہ اصول سے اور کبھی ہمارے عقلی وفطری مسلمات سے نکلتی ہے۔ جیسے ہم نے تعجیل کے اصول کو دیکھا کہ نماز کا وقت ہوتے ہی اسے ادا کرنا افضل عمل ہوگا۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ فجر میں عامۃ الناس کی رعایت سے تغلیس کی فضیلت کو نباہتے ہوئے اسے اسفار کے قریب لے جایا گیا۔ اسی طرح عشا میں کچھ اور حکمتوں کے تحت پسندیدہ وقت کے اختتام تک اس کی تاخیر کو پسند کیا گیا ہے۔

ان حکمتوں میں سے ایک کی طرف اشارہ سیدنا عمر کے اس قول سے مل رہا ہے کہ اسے سونے تک موخر کرو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عشا کی نماز بندہ مؤمن کا آخری عمل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد گپ شپ اور بات چیت کو پسند نہیں فرمایا:

عن ابی برزة الاسلمی... و کان یستحب ان یؤخر العشاء التی تدعونها العتمة و کان یکره النوم قبلها والحدیث بعدها... (بخاری، رقم ۵۲۲)

''ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے کہا... نبی صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے تھے کہ نماز عشا کو موخر کر کے پڑھیں، جسے تم 'العتمة' (تہائی رات والی نماز) کہتے ہو۔ آپ کو اس سے پہلے سونا اور اس کے بعد بات چیت کرنا، ناپسند تھا...۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز اگر آدمی کا آخری عمل ہو اور پھر صبح اٹھ کر وہ فجر کی نماز میں شامل ہوا ہو تو اس کی ساری رات گویا نماز میں گزری، اس لیے کہ سونے سے اس کا عمل منقطع ہو گیا تھا۔ اس انقطاع سے پہلے بھی وہ نماز میں تھا اور اس کے بعد بھی۔ اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

عن عثمان بن عفان رضی الله عنه ان النبی صلی الله علیه و سلم قال: من صلی العشاء فی جماعة فکانما قام نصف اللیل و من صلی الصبح فی جماعة فکانما صلی اللیل کله. (مسلم، رقم ۶۵۶)

''سیدنا عثمان سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جماعت کے ساتھ عشا پڑھی تو وہ یوں سمجھو کہ آدھی رات قیام میں رہا، اور پھر اس نے اگر صبح بھی جماعت کے ساتھ ادا کی تو وہ گویا پوری رات قیام میں رہا۔''

ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز اتنی موخر کی کہ آدھی رات کے قریب وقت آ گیا، پھر آپ نکلے اور نماز پڑھائی اور اس وقت کی نماز کی فضیلت بتائی۔ اس فضیلت کے جو مختلف پہلو کچھ روایتوں میں آئے ہیں، ان

میں سے ایک انتظار ہے۔ یعنی جب ایک نمازی عشا سے پہلے نہ سوئے اور صرف اس لیے جاگتا رہے کہ وہ عشا موخر کر کے پڑھے گا تو آپ نے فرمایا کہ وہ جتنی دیر تک انتظار میں رہا حالت نماز میں رہا۔ (بخاری، رقم ۵۷۵) اسی طرح آپ نے فرمایا کہ تاخیر کر کے نماز پڑھنا اس وقت نماز پڑھنا ہے، جب دوسری ملتوں کے لوگ سوئے ہوتے ہیں۔ (بخاری، رقم ۵۴۶) تیسرا پہلو یہ بیان فرمایا کہ پہلی امتوں نے بھی عشا کے لیے اتنا انتظار نہیں کیا تمھیں اس پہلو سے یہ فضیلت حاصل ہے۔ (مسند احمد، رقم ۲۲۱۱۹)

یہ وہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے عشا کی تاخیر پسندیدہ ہے۔ میرے خیال میں ان ساری فضیلتوں کا خلاصہ یہ ہے: قدیم معاشرت ہو یا جدید، رات کا ابتدائی وقت فراغت اور گپ شپ کا وقت ہے۔ عرب اس وقت میں رات کی مجلسیں سجاتے، قصے کہانیاں اور قصیدے سناتے۔ دین کو ان تفریحات سے دشمنی نہیں ہے۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ بندہ اس لہو ولعب کے بعد خدا کی طرف لوٹے۔ چنانچہ یہ بات پسندیدہ نہیں ہوگی کہ آدمی عشا کے ہوتے ہی فٹا فٹ نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے اور پھر گپ شپ اور ادھر ادھر کی چیزوں میں جاگ کر وقت گزارے۔ یہ نماز سے جان چھڑانے کا سارویہ محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ پسندیدہ یہ ہے کہ وہ سب امور سے فارغ ہو کر تسلی سے عشا ادا کرے، اور اس کے لیے انتظار کرے، تاکہ اس نماز میں تعجیل عجلت بن کر نہ رہ جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آپ نے عشا کے ساتھ دو امور کا اہتمام کیا، ایک تو یہ کہ اسے ایک تہائی رات تک موخر کیا۔ یہ انبیا کے پسندیدہ اوقات میں سے عشا کا آخری وقت ہے۔ اس سے زیادہ تاخیر صرف دو مواقع پر ہوئی۔ ان مواقع پر عشا نصف لیل سے ذرا پہلے ادا کی گئی۔

دوسرے آپ جب نماز موخر کرتے تو اس میں تخفیف کرتے، یعنی قیام وغیرہ زیادہ لمبا نہ کرتے۔ اس لیے کہ نماز کے انتظار میں جاگنے والوں کے لیے یہ اکتاہٹ کا باعث نہ بنے:

عن جابر بن سمرة قال: كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم يصلي الصلوات نحوا من صلاتكم و كان يؤخر العتمة بعد صلاتكم شيئا و كان يخف الصلاة. (مسلم، رقم ۶۴۳)	''جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری نمازیں ویسی ہی پڑھتے جیسی تم لوگ پڑھتے ہو، مگر عشا کو وہ تمھاری نماز سے ذرا زیادہ تہائی رات تک موخر کرتے، اور وہ ذرا اس میں تخفیف کرتے۔''

دونوں خطوط میں عصر پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کے وقت کو بیان کرنے میں نہایت تفصیل کی گئی ہے۔

جیسے پہلی روایت میں دیکھیں تو الفاظ یہ ہیں:

''جب سورج ابھی سفید روشن ہو، زرد نہ ہوا ہو۔''

دوسری روایت کو دیکھیں تو الفاظ میں مزید تاکید ہے:

''جب ابھی سورج روشن ہو اور زرد نہ ہوا ہو، (غروب سے) اتنا پہلے کہ ایک مسافر تین فرسخ فاصلہ طے کر سکے۔''

ان الفاظ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ عصر کی تعجیل پر کچھ زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ قدیم معاشرت میں عصر کا وقت کاموں کے نبٹانے اور سمیٹنے کا وقت ہوتا تھا۔ اس لیے یہ امکان تھا کہ عمال یا تاجر وغیرہ اسے غروب کے وقت تک ٹال دیتے اور آخر وقت میں نماز ادا کرتے۔ یہی اندیشہ ہے جس وجہ سے حضرت عمر جماعت کی نماز کا وقت عمال کے ذریعے سے سورج کے سفید ہونے تک مقرر کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف وہ اس پر زور دے رہے تھے کہ اس کا اتنا خیال رکھو کہ عصر کے بعد آدمی تین فرسخ تک کا فاصلہ طے کر سکے۔ عصر کے بارے میں یہی ٹال مٹول ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا:

عن انس قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم یقول تلک صلاۃ المنافق یجلس یرقب الشمس حتی اذا کانت بین قرنی الشیطان قام فنقرھا اربعا لا یذکر اللّٰہ فیھا الا قلیلا۔ (مسلم، رقم ۶۲۲)

''حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا سورج کو دیکھتا رہے کہ جب وہ ڈوبنے والا ہو تو اٹھ کر چار ٹھونگے مار لے، اور اس میں تلاوت و تسبیحات مختصر کرے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دکان داروں کے شدید مشغولیت میں پڑ کر نماز ضائع کر بیٹھنے کے مسئلہ کا حل بھی ہے کہ عصر کا وقت ہوتے ہی نماز پڑھ لو، تاکہ بازار میں رش ہوتے ہوتے تم نماز پڑھ کر فارغ ہو چکو۔ اور پھر مغرب تک گاہکوں کے لیے اپنے کام پر موجود رہو۔

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۴)

گزشتہ سے پیوستہ

فضائل و رذائل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا، وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ، وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا، فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا، وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ، وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىْ صَغِيْرًا . رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِىْ نُفُوْسِكُمْ، اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ، فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا . وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ، وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا. اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ، وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا . وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ، تَرْجُوْهَا، فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا، وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ، وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ، فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا، اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ، اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا . وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ، اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا. وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً، وَسَآءَ سَبِيْلًا. وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ،

اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا. وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ، وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَھۡدِ، اِنَّ الۡعَھۡدَ کَانَ مَسۡئُوۡلًا. وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ، ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا. وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ، اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡئُوۡلًا. وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا، اِنَّکَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا. کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنۡدَ رَبِّکَ مَکۡرُوۡھًا.

ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰٓی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ، وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰی فِیۡ جَھَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۲۔۳۹)

’’اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ کہ (قیامت کے دن) ملامت زدہ اور دھتکارے ہوئے ہو کر رہ جاؤ۔ اور (یاد رکھو کہ) تمھارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ تمھارے سامنے اگر اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو نہ اف کہو، نہ جھڑک کر جواب دو، بلکہ ادب کی بات کرو اور اُن کے لیے مہر و محبت کے ساتھ عاجزی کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، اِن پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔ تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اُسے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو (جان لو کہ) پلٹ کر آنے والوں کے لیے وہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔ اور قرابت مند کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور مال کو اللّے تللّے نہ اڑاؤ۔ اس لیے کہ مال کو اِس طرح اڑانے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر اِن (ضرورت مندوں) سے اِس بنا پر اعراض کرنا پڑے کہ ابھی تم اللہ کی رحمت تلاش کر رہے ہو، جس کے تم امیدوار ہو، تو اِن سے نرمی کی بات کہہ دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ گردن سے باندھے رکھو اور نہ اُسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ (اِس کے نتیجے میں) ملامت زدہ اور درماندہ بن کر بیٹھے رہو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ اِس لیے کہ اُن کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے پاس نہ جاؤ، اِس لیے کہ وہ کھلی بے حیائی اور بہت بری راہ ہے۔ اور جس جان کی حرمت اللہ نے قائم کر دی ہے، اُسے ناحق قتل نہ کرو اور (یاد رکھو کہ) جسے مظلومانہ قتل کیا جائے، اُس کے ولی کو ہم نے اختیار دیا ہے۔ پھر اُسے بھی چاہیے کہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اِس لیے کہ اُس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو۔ ہاں، مگر اچھے طریقے سے، یہاں تک کہ وہ پختہ عمر کو پہنچ جائے۔ اور عہد کی پابندی کرو، اِس لیے کہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی اچھا طریقہ ہے۔ اور اُس چیز کے پیچھے نہ پڑو جسے تم نہیں جانتے، اِس لیے کہ آنکھ، کان اور دل، اِن میں سے ہر ایک کی پرسش ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو،

www.javedahmadghamidi.com

اِس لیے کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اِن میں سے ہر چیز کی برائی تمھارے پروردگار کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔

یہ وہ حکمت ہے جو تمھارے رب نے تمھاری طرف وحی کی ہے۔ (اسے مضبوطی سے پکڑو) اور (آخر میں ایک مرتبہ پھر سن لو کہ) اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہ بناؤ کہ (اِس کے نتیجے میں) راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جاؤ۔''

اس سے پہلے جو بنیادی اصول بیان ہوا ہے، یہ اسی کے اجمال کی شرح ہے جس میں اخلاق کے فضائل و رذائل بالکل متعین طریقے پر واضح کر دیے گئے ہیں۔ ان میں، اگر غور کیجیے تو سلسلۂ بیان کی ابتدا بھی شرک کی ممانعت سے ہوئی ہے اور اس کا خاتمہ بھی اسی کی تاکید پر کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب کسی چیز کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ درمیان میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے لیے یہ عقیدہ گویا شہر پناہ ہے جس کے وجود سے شہر قائم رہتا اور جس میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو پورا شہر خطرے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے، اس کے لیے توحید کی حیثیت یہی ہے۔ یہ اس عدل کا سب سے بڑا اور بنیادی تقاضا ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ چنانچہ شرک کو اسی بنا پر ظلم عظیم کہا گیا ہے[13] اور اس کا یہ نتیجہ بھی قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے جس کی پاداش میں لوگ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ، وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ، وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَرٰٓى اِثۡمًا عَظِيۡمًا. (النساء ۴: ۴۸)

''اللہ اِس بات کو معاف نہیں کریں گے کہ (جانتے بوجھتے) اُن کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہیں گے، (اپنے قانون کے مطابق) معاف کر دیں گے۔ اور (اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ) جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، اُس نے ایک بڑے گناہ کا افترا کیا ہے۔''

یہ شرک کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الٰہ بنایا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح میں اسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اس طرح کسی نہ کسی درجے میں اسے اللہ تعالیٰ کا ہم سر بنا دیا جائے۔

---

[13] لقمان ۳۱: ۱۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیوں کا عقیدۂ وحدت الوجود بھی اسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندووں میں برہما، وشنو، شیو اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی ہستیوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم وکواکب اور شیاطین کے تصرفات پر ایمان کو بھی اسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. (الاخلاص ۱۱۲)

''تم اعلان کرو (اے پیغمبر) کہ وہ اللہ تنہا ہے۔ اللہ سب کے لیے پناہ کی چٹان ہے۔ وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہم سر ہے۔''

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ، ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ، يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ، يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا، وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ، اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. (الاعراف ۷: ۵۴)

''تمھارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے چھ دن میں زمین وآسمان پیدا کیے، پھر اپنے عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے جو اِس کے پیچھے دوڑی چلی آتی ہے۔ اور اُس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے جو اُس کے حکم پر کام میں لگے ہوئے ہیں۔ سن لو، خلق بھی اُسی کے لیے ہے اور تدبیر امور بھی۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جہانوں کا پروردگار۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان عقائد کے ماننے والے اس کے ساتھ بالعموم یہ بھی مانتے ہیں کہ ان ہستیوں کو خدا نے یہ حیثیت دے رکھی ہے کہ یہ جب چاہیں کسی غیب پر مطلع ہوسکتی اور اپنی سفارش سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو دنیا اور آخرت میں تبدیل کرا سکتی ہیں۔ قرآن نے ان دونوں ہی باتوں کی تردید کر دی ہے۔

پہلی بات کے بارے میں فرمایا ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ. (النمل ۲۷: ۶۵)

''کہہ دو، زمین وآسمان میں کوئی بھی اللہ کے سوا غیب سے واقف نہیں ہے اور (جنھیں یہ حیثیت دی جاتی ہے)، اُنھیں تو پتا بھی نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

دوسری بات کے بارے میں فرمایا ہے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ.

(الزمر ۳۹: ۴۴)

''کہہ دو کہ تمام شفاعت اللہ ہی کے اختیار میں ہے، زمین وآسمان کی بادشاہی اسی کی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

اپنے اوہام کو یہ لوگ تصویروں اور مجسموں میں بھی ڈھالتے ہیں۔قرآن نے اسے اصنام واوثان کی نجاست قرار دیا اور اس سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے: 'فاجتنبوا الرجس من الاوثان، واجتنبوا قول الزور.[14]' (ان بتوں کی گندگی سے بچو اور ان کے بارے میں جو جھوٹ تم اللہ پر باندھتے ہو، اس سے بھی اجتناب کرو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن یہ تصویریں اور مجسمے بنانے والے شدید ترین عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان سے تقاضا کیا جائے گا کہ اپنے زعم کے مطابق جن زندہ اور نافع وضار ہستیوں کی تصویریں تم بناتے رہے ہو، ان میں اب جان ڈال کر دکھاؤ۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان الذین یصنعون ہذہ الصور، یعذبون یوم القیٰمۃ، یقال لہم: احیوا ما خلقتم.

(بخاری، رقم ۵۶۰۷)

''اس طرح کی تصویریں جو لوگ بناتے ہیں، انھیں قیامت میں عذاب دیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے، اسے اب زندہ کرو۔[15]''

ان ہستیوں سے استمداد پر مبنی تعویذ گنڈوں میں بھی یہی نجاست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس طرح کی جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی میں جدائی ڈالنے کے تعویذ، سب شرک ہیں۔[16]

اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کو بھی آپ نے اسی کے تحت رکھا ہے، اس لیے کہ اس میں بھی آدمی جس کی قسم کھاتا ہے، اسے درحقیقت کسی واقعے پر گواہ بناتا ہے اور اس طرح گویا اسے خدا ہی کی طرح عالم الغیب قرار دیتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

من حلف بغیر اللّٰه فقد اشرك.

(ابوداؤد، رقم ۳۲۵۱)

''جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کھائی، اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔''

اس ضمن میں بعض مشرکانہ رویے بھی قابل توجہ ہیں:

اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کی تمثیل بیان فرمائی ہے جو اپنی دولت وثروت، جمعیت وعصبیت اور خدم وحشم کی

---

[14] الحج ۲۲: ۳۰۔

[15] یہی تصویریں ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا ہے۔ عام تصویروں سے اس ممانعت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[16] ابوداؤد، رقم ۳۸۸۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کارفرمائیوں کے غرور میں مبتلا ہو کر یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اسے جو کچھ حاصل ہے، یہ اس کی صلاحیت و قابلیت کا کرشمہ اور اس کے علم و تدبر کا ثمرہ ہے۔ یہ ہمیشہ اسی کے پاس رہے گا، قیامت اول تو آئے گی نہیں اور اگر آئی تو یہی سب، بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ اسے وہاں بھی حاصل ہو جائے گا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اس کا لہلہاتا باغ جب ایک دن تباہ ہو گیا تو ان اصنام کی حقیقت کھل گئی اور وہ پکار اٹھا کہ ہائے، میری کم بختی، میں نے کیوں ان چیزوں کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھیرایا تھا:

وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ عَلٰی مَآاَنْفَقَ فِیْهَا، وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا، وَیَقُوْلُ: یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا. (الکہف ۱۸:۴۲)

''اور ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور اپنے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر وہ اپنے لگائے ہوئے مال پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ اے کاش، میں کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہ بناتا۔''

یہی معاملہ ریا کا ہے۔ وہ کام جو صرف خدا کے لیے ہونے چاہییں، اگر دوسروں کے لیے ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دوسروں نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا ہے[17]۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں، لہٰذا جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا، میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا ہے[18]۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کے توہمات کی حقیقت بھی یہی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان پر متنبہ فرمایا ہے۔ اسی طرح سد ذریعہ کے اصول پر بعض ان چیزوں سے بھی روکا ہے جو اگرچہ شرک تو نہیں ہیں، لیکن اس تک لے جانے کا باعث ہو سکتی ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک رات تارا ٹوٹا تو آپ نے دریافت فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں تم ان کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم سمجھتے تھے کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا پیدا ہوتا ہے تو تارے ٹوٹتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں، کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے تارے نہیں ٹوٹتے[19]۔

زید بن خالد کا بیان ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی۔ صبح کو نماز کے بعد آپ لوگوں سے

---

[17] ابن ماجہ، رقم ۴۲۰۴۔

[18] ابن ماجہ، رقم ۴۲۰۲۔

[19] مسلم، رقم ۲۲۲۹۔

مخاطب ہوئے اور فرمایا: جانتے ہو، تمھارے رب نے کیا کہا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔ ارشاد ہوا: اللہ نے فرمایا ہے کہ آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر، جنھوں نے یہ کہا کہ یہ بارش اللہ کے فضل و رحمت سے ہوئی ہے، وہ میرے ماننے والے اور تاروں کے منکر ہیں اور جنھوں نے یہ کہا کہ ہم پر پانی فلاں پچھتر سے برسا ہے، وہ میرے منکر اور تاروں کے ماننے والے ہیں۔[20]

ابو مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورج اور چاند کسی کے مرنے یا جینے سے نہیں گہناتے، یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، لہٰذا انھیں دیکھو تو نماز پڑھو۔[21]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجۂ محترمہ کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: جو اپنی کسی چیز کا پتا پوچھنے کسی عراف[22] کے پاس جائے گا، اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہو گی۔[23]

سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ لوگوں نے کاہنوں کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ کچھ نہیں ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا: شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قر قر کر کے اپنے دوستوں کے کانوں میں ڈالتا ہے۔ پھر وہ سو جھوٹ اس کے ساتھ ملا کر لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔[24]

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے اور نہ مردے کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔[25]

جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ غول بیابانی بھی کچھ نہیں ہے۔[26]

سیدنا عمر کا بیان ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو،

۲۰؎ بخاری، رقم ۸۱۰۔ مسلم، رقم ۷۱۔

۲۱؎ بخاری، رقم ۹۹۴۔

۲۲؎ یہ وہ لوگ تھے جو چوری کا پتا بتانے کا دعویٰ کرتے تھے۔

۲۳؎ مسلم، رقم ۲۲۳۰۔

۲۴؎ بخاری، رقم ۵۸۵۹۔ مسلم، رقم ۲۲۲۸۔

۲۵؎ بخاری، رقم ۵۳۸۰۔ مسلم، رقم ۲۲۲۰۔

۲۶؎ مسلم، رقم ۲۲۲۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی شان میں کیا ہے۔ میں تو بس خدا کا بندہ ہوں، اس لیے مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہا کرو۔[۲۷]

ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ نے اسے فوراً روکا اور فرمایا: تم نے مجھے خدا کا ہم سر بنا دیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ کہو کہ جو تنہا اللہ چاہے۔[۲۸]

[باقی]

---

۲۷ بخاری، رقم ۳۲۶۱۔

۲۸ احمد، رقم ۱۸۳۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

اسلام اور مصوری

جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر

(۴)

خلاصۂ مباحث

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلام اور مصوری کے زیر عنوان گزشتہ مباحث میں جو باتیں سامنے آئی ہیں، نکات کی صورت میں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ مصوری مباحات فطرت میں سے ہے۔

۲۔ قرآن مجید سے اس کی فطری اباحت کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ اس کتاب میں اللہ کے ایک پیغمبر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تصویریں بنوانے کا ذکر ہوا ہے۔

۳۔ بائیبل سے بھی اس کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی عبادت گاہ میں فرشتوں اور بعض حیوانات کی تصویریں بنوائی تھیں۔

۴۔ احادیث سے بھی مصوری کی اباحت ہی کا حکم مستنبط ہوتا ہے۔ ان میں بیان ہوا ہے کہ:

○ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنی صاحب زادی کے گھر پر تصویر والا پردہ لٹکانے سے منع

کیا، مگر وہی پردہ کسی اور کو استعمال کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ اپنے اور اپنی صاحب زادی کے دروازے پر اس پردے کو لٹکانے سے منع کرنے کا سبب روایت میں تصویر کی حرمت نہیں، بلکہ تزئین و آرایش بیان ہوا ہے۔

o آپ کے سامنے سیدہ عائشہ کی گڑیاں اور کھلونے موجود رہے، مگر آپ نے ان کی نکیر نہیں فرمائی۔

o آپ نے بیٹھنے کے لیے ایک ایسے تکیے کو استعمال کیا جس پر تصویر بنی ہوئی تھی۔

o ایک موقع پر آپ نے سیدہ کو تصاویر والا پردہ سرکانے کا حکم دیا اور اس کا سبب تصویر کی حرمت نہیں، بلکہ نماز میں توجہ بٹنا بتایا۔

ان نکات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مصوری کو دین و شریعت نے ہرگز ممنوع قرار نہیں دیا۔ چنانچہ اس کی تمام انواع اصلاً جائز ہیں۔ البتہ اسلام نے اس فن کے ان تمام مظاہر کو حرام قرار دیا ہے جو شرک سے وابستہ یا مشرکانہ مراسم کی عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید، بائیبل اور احادیث میں ایسے مجسموں، شبیہوں اور تصویروں کو شنیع قرار دیا گیا ہے جو مشرکانہ عقائد اور مراسم سے کوئی علاقہ رکھتی تھیں۔ قرآن، بائیبل اور احادیث کے حوالے سے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں اس شناعت کے ضمن میں حسب ذیل چیزیں بیان ہوئی ہیں:

o سورۂ انبیا میں نقل ہوا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو، کیا اللہ کے سوا تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں، تف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔

o سورۂ نجم میں لات، منات اور عزیٰ کی تماثیل کے حوالے سے عربوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔

o سورۂ اعراف میں مشرکین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو، نہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں، تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں، لیکن انھیں کچھ بھی سوجھتا نہیں ہے۔

۲۔ بائیبل میں مشرکانہ پہلو سے مصوری کی شناعت کے مقامات حسب ذیل ہیں:

o یرمیاہ میں اہل بابل کو تنبیہ کرتے ہوئے ان کے ملک کو ''تراشی ہوئی مورتوں کی مملکت'' کہا گیا ہے اور ان مورتوں کو باطل قرار دے کر ان کی بربادی کا اعلان کیا گیا ہے۔

o یسیعاہ میں بیان ہوا ہے کہ جو لوگ ان مورتوں اور بتوں پر ایمان رکھتے اور انھیں اپنے معبود کا درجہ دیتے ہیں، انھیں بالآخر سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

o احبار اور بعض دوسرے مقامات پر بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کی سلطنت میں بت پرستی پر سخت پابندی ہونی چاہیے اور عبادت کی غرض سے کوئی مورت اور شبیہ نہ بنائی جائے۔

o تورات کے بعض مقامات پر جہاں مورتیں بنانے اور خدا کے ماسوا کسی کو معبود بنانے کا ذکر ہوا ہے، وہاں ان مشرکانہ افعال پر تنبیہ کرتے ہوئے خدا کی صفت غیرت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ خروج میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بیان ہوا ہے کہ:

> ''میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔''

o استثنا میں نقل ہوا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لاویوں کو یہ حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے سب لوگوں سے کہیں کہ:

> ''لعنت اس آدمی پر جو کاری گری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔''

o زبور میں بتوں کی بے ثباتی اور بے وقعتی کو نہایت دل نواز انداز میں بیان کیا گیا ہے اور انھیں نطق، بصارت اور سماعت کی صلاحیتوں سے محروم قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ احادیث میں حسب ذیل باتیں بیان ہوئی ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

o جس گھر میں (پوجی جانے والی) تصاویر ہوں، اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

o وہ شخص نہایت درجہ ظالم ہے جو اللہ کی طرح وصف تخلیق کا حامل ہونے کے زعم میں مبتلا ہوا اور اس بنا پر (پتھر تراش کر) اس کی مخلوقات جیسی مخلوقات بنانے کی کوشش کرے۔

o (پوجی جانے والی تصویریں بنانے والے) مصور ملعون ہیں۔ قیامت میں انھیں سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

o (بتوں کی تکریم کے لیے ان کی) نصب کی ہوئی تماثیل مکروہ ہیں۔

o نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس چیز کو توڑ دیتے جس پر (مشرکانہ مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی) صلیب کی تصویر بنی ہوتی۔

o اہل کلیسا میں سے وہ لوگ جو قبروں پر عبادت گاہیں تعمیر کرتے اور ان میں (پرستش کی غرض سے سیدنا مسیح علیہ السلام اور سیدہ مریم علیہا السلام) کی تصویریں بناتے ہیں، قیامت میں بدترین مخلوق قرار پائیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

o قیامت میں سب لوگ اپنے اپنے معبود کی پیروی میں چلیں گے۔ (غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں میں سے) صلیب کے پجاری صلیب کی، تصاویر کے پجاری تصاویر کی اور آگ کے پجاری آگ کی پیروی میں چلیں گے۔

o بیت اللہ میں ۳۶۰ تماثیل اور تصاویر تھیں۔ ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصویروں کو مٹانے اور مجسموں کو نکالنے کا حکم دیا اور آپ اس وقت تک اندر داخل نہیں ہوئے جب تک اللہ کے گھر کو ان سے پاک نہیں کر دیا گیا۔

o نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر (پوجی جانے والی) تصویر اور مجسمے کو مٹا دیا جائے اور ہر (پوجی جانے والی) قبر کو سطح زمین کے برابر کر دیا جائے۔

مصوری کی حرمت کے استدلال کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مصوری کے حوالے سے ہمارے فقہا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جان دار مخلوقات کی تصاویر حرام اور بے جان مخلوقات کی جائز ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی اساس وہ روایتیں ہیں جن میں اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے کی مذمت کی گئی ہے اور ایسی چیزوں کی تصویر بنانے سے منع کیا گیا ہے جن میں روح پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں فقہ کی کتابوں سے چند نمائندہ اقتباسات حسب ذیل ہیں:

قال اصحابنا و غيرهم تصوير صورة الحيوان حرام اشد التحريم و هو من الكبائر و سواء صنعه لما يمتهن او لغيره فحرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق اللّٰه و سواء كان فى ثوب أو بساط أو دينار أو درهم أو فلس أو إناء أو حائط و اما ما ليس فيه صورة حيوان كالشجر و نحوه، فليس بحرام و سواء كان فى هذا كله ما له ظل و ما لا ظل له و بمعناه. قال جماعة العلماء مالك و الثورى و أبو حنيفة و غيرهم و قال القاضى إلا ما ورد فى لعب البنات و كان مالك يكره شراء ذلك.

(عمدۃ القاری ۲۲/ ۷۰)

''ہمارے اصحاب (فقہاے احناف) اور ان کے علاوہ دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ جان دار کی تصویر

بالکل حرام ہے۔ اسے بنانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر اہانت کے مقام پر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہو یا عظمت کے مقام پر رکھنے کے لیے، کیونکہ اس میں خدا کی تخلیق کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ تصویر خواہ کسی کپڑے، بچھونے، دینار، درہم، پیسے، برتن یا دیوار پر بنی ہو، حرمت میں سب برابر ہیں۔ البتہ اگر اس تصویر میں کسی جان دار کی شکل نہ ہو تو پھر یہ حرام نہیں ہے۔ (جو تصاویر حرام ہیں ان میں) حرمت کا معاملہ یکساں ہوگا، خواہ وہ مجسمہ ہوں جس کا سایہ ہوسکتا ہے یا ایسی تصاویر ہوں جن کا سایہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تصویر کے معاملے میں یہی رائے علما کی اس جماعت کی بھی ہے جس میں امام مالک، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور دوسرے علما شامل ہیں۔ البتہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لڑکیوں کی گڑیاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جب کہ امام مالک رحمہ اللہ ان کی خرید و فروخت کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔''

وقالوا كره عليه السلام ما كان سترا ولم يكره ما يداس عليه ويوطأ بهذا قال سعد بن ابى وقاص وسالم وعروة وابن سيرين وعطاء وعكرمة قال عكرمة يوطأ من الصورة هو ذل لها وهذا اوسط المذاهب وبه قال مالك والثورى وابو حنيفة والشافعى. (عمدۃ القاری ۱۰/۳۱۳)

''حضرات صحابہ وتابعین نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصاویر کو ناپسند کیا ہے جو پردہ کی صورت میں (معلق اور کھڑی) ہوں اور ان تصاویر کو ناپسند نہیں کیا جو پامال ہوں اور ان پر بیٹھا یا لیٹا جائے۔ یہی قول حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سالم بن عبداللہ اور عروہ اور ابن سیرین کا اور حضرت عطاء اور عکرمہ کا ہے۔ عکرمہ نے فرمایا کہ جو تصاویر پاؤں میں روندی جائیں یہ ان کی ذلت ہے۔ یہ رائے سب سے بہتر اور معتدل ہے۔ یہی مذہب امام مالک، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ وشافعی کا ہے۔''

قال اصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر لانه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور فى الاحاديث وسواء صنعه بما يمتهن او بغيره فصنعته حرام بكل حال لان فيه مضاهاة بخلق اللّٰه تعالىٰ وسواء ما كان فى ثوب او بساط او درهم او دينار او فلس او اناء او حائط او غيرها واما تصويرصورة الشجر ورحال الابل وغيره ذلك مما ليس فيه صورة حيوان فليس بحرام هذا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حکم نفس التصویر واما اتخاذ المصور فیه صورة حیوان فان کان معلقا علی حائط او ثوبا ملبوسا او عمامة ونحو ذلك مما لا یعد ممتهنا فهو حرام وان کان فی بساط یداس ومخدة ووسادة نحوها مما یمتهن فلیس بحرام ولا فرق فی هذا کله بین ماله ظل و ما لا ظل له هذا تلخیص مذهبنا فی المسئلة وبمعناة قال جماهیر العلماء من الصحابة والتابعین ومن بعدهم وهو مذهب الثوری ومالك وابی حنیفة وغیرهم.

(نووی مع مسلم ۲/۱۹۹)

''ہمارے (مسلک شافعی کے) فقہا اور ان کے علاوہ دوسرے علما فرماتے ہیں کہ جان دار کی تصویر بالکل حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیونکہ اس پر وہ وعید شدید وارد ہوئی ہے جو احادیث میں آئی ہے۔ یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر توہین کے مقام پر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہو یا شرف کے مقام پر رکھنے کے لیے، کیونکہ اس میں خدا کی تخلیق کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ تصویر خواہ کسی کپڑے، بچھونے، درہم، دینار، پیسے، برتن، دیوار یا کسی اور چیز پر بنی ہو، حرمت میں سب برابر ہیں اور جہاں تک درخت کی یا پالان کی یا ایسی ہی دوسری اشیا کی تصاویر کا تعلق ہے، جن میں روح نہیں ہوتی، تو وہ تصاویر حرام نہیں ہیں۔ یہ حکم تو تصویر بنانے کے بارے میں ہے۔ جہاں تک اس چیز کے استعمال کا تعلق ہے، جس پر کسی جان دار کی تصویر بنی ہو، وہ شے اگر دیوار پر معلق ہے یا وہ پہنا ہوا لباس ہے یا عمامہ ہے یا اس کی مثل کوئی اور ایسی چیز ہے، جو عموماً ذلیل وحقیر نہیں سمجھی جاتی، تو اس چیز کا استعمال حرام ہے۔ اور اگر جان دار کی یہ تصویر کسی بچھونے پر ہے جسے روندا جاتا ہے یا گدے اور تکیے پر یا اس کی مثل کسی ایسی چیز پر ہو جو عموماً پامال ہوتی ہے، تو اس چیز کا استعمال حرام نہیں ـــــ اور اِن سب تصاویر میں اس پہلو سے کوئی فرق نہیں کہ وہ مجسم ہوں جن کا سایہ پڑتا ہے یا وہ محض رنگ ونقش ہوں، جن کا سایہ نہیں ہوتا۔ تصویر کے معاملے میں یہ ہمارے مذہب کا خلاصہ ہے۔ اسی کی مثل صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور مابعد کے اکثر علما کی رائے ہے۔ امام ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ دوسرے علما کا مذہب بھی یہی ہے۔''

فقہا کے درج بالا نقطہ ہائے نظر خلاصہ نکات کی صورت میں حسب ذیل ہے:

- جان دار مخلوقات مثلاً انسان یا حیوان کی تصویر حرام ہے اور اسے بنانا گناہ کبیرہ ہے۔

o یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر مجسم ہو یا کسی چیز پر نقش ہو۔

o یہ حرمت ہر حال میں ہے، خواہ تصویر محل عظمت میں ہو یا محل اہانت میں۔

o بے جان اشیا مثلاً درخت یا پہاڑ کی تصویر جائز ہے اور اسے بنانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

بعض فقہا کے نزدیک جان دار تصویروں کی حرمت سے دو طرح کی تصویریں مستثنیٰ ہیں:

ایک وہ جو محل اہانت میں پامال ہوں۔

دوسری وہ جو کھلونوں اور گڑیوں کی صورت میں بچوں کے کھیلنے کے لیے استعمال ہوں۔

جان دار کی تصویروں کی حرمت کے حوالے سے فقہا کے استدلال کا زیادہ تر انحصار ان روایتوں پر ہے جن میں یہ باتیں بیان ہوئی ہیں[۵۸]:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میرے مخلوقات بنانے کی طرح مخلوق بنانے نکل کھڑا ہو۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان سے کہا جائے گا کہ انھیں زندہ کر کے دکھاؤ۔

۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے تصویر بنائی اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اس میں روح پھونکو۔ چنانچہ ایک مصور کے استفسار پر حضرت ابن عباس نے اس فرمان نبی کی روشنی میں اس کو نصیحت کی کہ اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو درخت کی بنا لے، ایسی چیز کی تصویر نہ بنا جس میں روح ہوتی ہے۔

ان روایتوں کی بنا پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جان دار کی تصویر حرام ہے۔ ہمارے نزدیک ان روایتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ روایتوں کا پس منظر اور ان کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۸؎ یہ روایتیں ''مصوری کی شناعت'' کے تحت زیر بحث آ چکی ہیں، یہاں ان کا بیان محض علما کے استدلال کی تنقیح کے حوالے سے ہے۔

متون یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مانع ہیں۔ جہاں تک پس منظر کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے مختلف تفصیلات ہم نے ''احادیث اور مصوری کی شناعت'' کے زیرِ عنوان گزشتہ بحث میں نقل کر دی ہیں۔ ان کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چونکہ عرب مصور بتوں اور ان کی تصویروں کو بے روح قالب کے طور پر نہیں، بلکہ زندہ وجود کے طور پر بناتے اور ان میں روحوں کے حلول کے قائل تھے، اس لیے انھیں بطور تنبیہ یہ کہا گیا کہ جن جمادات کو تم زندہ اور حامل روح خیال کرتے ہو، قیامت میں تمھیں سزا کے طور پر ان کو زندہ کر کے دکھانے اور ان کے جسد میں روح پھونکنے کا حکم دیا جائے گا۔[۵۹]

یہاں ہم مختصر طور پر یہ بیان کریں گے کہ مذکورہ روایتوں کے متون کس طرح یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مانع ہیں کہ جان دار کی تصویر حرام ہے۔

ایک روایت یہ ہے:

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول قال اللّٰہ عز وجل ومن اظلم ممن ذھب یخلق خلقا کخلقی . فلیخلقوا ذرۃ او لیخلقوا حبۃ او لیخلقوا شعیرۃ . (مسلم، رقم ۲۱۱۱)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو میرے مخلوق بنانے کی طرح مخلوق بنانے نکل کھڑا ہوا۔ (ایسی جسارت کرنے والوں کو چاہیے کہ) وہ ایک ذرہ تو تخلیق کر کے دکھائیں یا گندم یا جو کا ایک دانہ ہی تخلیق کر کے دکھا دیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہمارے نزدیک اس روایت سے حسب ذیل پہلوؤں کی وجہ سے جان دار کی تصویر کی حرمت کا مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا:

اولاً، اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے کے الفاظ کا مصداق تصویر کو ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی انسان کے مجسمے، شبیہ یا تصویر کو انسان کا عکس یا نقش تو کہا جا سکتا ہے، مگر اس کے مانند مخلوق نہیں کہا

---

۵۹ اس نقطۂ نظر پر بحث ''مصوری کی شناعت'' کے زیرِ عنوان تمہید اور ابتدائی روایتوں کے تحت کی گئی ہے۔

جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جیسی مخلوق بنانے سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا وجود بنایا جائے جو گوشت پوست سے بنا ہو، متحرک ہو، کھاتا پیتا، جیتا جاگتا، سنتا بولتا ہو اور ارادہ و اختیار کا مالک ہو۔ یہ خصائص چونکہ ادنیٰ درجے میں بھی کسی تصویر یا مجسمے میں نہیں ہوتے، اس لیے اسے کسی طرح بھی اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ 'یخلق خلقا کخلقی' کے الفاظ سے جان دار کی تصویر مراد لینا تو دور کی بات ہے، تصویر مراد لینا بھی مشکل ہے۔

ثانیاً، برسبیل تنزل اگر ان الفاظ سے تصویر کا مفہوم مراد لے بھی لیا جائے تب بھی جان دار کی تخصیص تو کسی حال میں نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ لفظ مخلوق کا اطلاق جس طرح جان دار اشیا پر ہوتا ہے، اسی طرح بے جان اشیا پر بھی ہوتا ہے۔ انسان اور حیوان کو بھی اللہ نے تخلیق کیا ہے اور شجر و حجر بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ یعنی جمادات اور نباتات میں سے کسی چیز کو اللہ کی مخلوق کے زمرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مزید براں 'یخلق خلقا کخلق' کے دائرے سے جمادات یعنی بے جان چیزوں کو خارج کرنے میں اسی روایت کے یہ الفاظ حارج ہیں: 'فلیخلقوا ذرة او لیخلقوا حبة او لیخلقوا شعیرة'، ''وہ ایک ذرہ تو تخلیق کر کے دکھائیں یا ایک دانہ یا ایک جو ہی تخلیق کر کے دکھا دیں''۔ یہاں ذرے، دانے اور جو کا ذکر اللہ کی تخلیق کے طور پر آیا ہے اور یہ چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر تخلیق کرنے کا دعویٰ رکھتے ہو تو اللہ کی ان نہایت چھوٹی مخلوقات کو تو بنا کر دکھاؤ۔ یعنی اگر تم 'یخلق خلقا کخلقی' کے مصداق انسانوں اور حیوانوں جیسی میری عظیم الشان مخلوقات بنانے کے دعوے دار ہو تو میری ہی بنائی ہوئی چند چھوٹی مخلوقات مثلاً مٹی کا ذرہ اور اناج کا دانہ ہی بنا کر دکھاؤ۔ گویا ذرہ، دانہ اور جو بنانا 'یخلق خلقا کخلقی' کا عین مصداق ہے۔ یہ تینوں اشیا، ظاہر ہے کہ بے روح ہیں اور من جملۂ حیوانات نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ روایت کے اپنے الفاظ جان دار کی تخصیص کرنے میں مانع ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اس روایت سے تخصیص کا حکم نکالنا بھی چاہے تو اسے جان دار کی نہیں، بلکہ ان تین مثالوں کی بنا پر بے جان کی تخصیص کرنی ہو گی۔

دو مزید روایتیں یہ ہیں:

عن عائشة ... فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اصحاب هذه الصور یعذبون ویقال لهم احیوا ما خلقتم. (مسلم، رقم ۲۱۰۷)

''سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: ان تصاویر والوں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے تخلیق کیا ہے، اسے زندہ کرو۔''

عن سعید بن ابی الحسن قال کنت عند ابن عباس رضی اللّٰه عنهما اتاه رجل فقال یا ابا عباس انی انسان انما معیشتی من صنعة یدی وانی اصنع هذه التصاویر فقال ابن عباس لا احدثك الا ما سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول سمعته یقول من صور صورة فان اللّٰه معذبه حتی ینفخ فیها الروح ولیس بنافخ فیها ابداً فربا الرجل ربوة شدیدة واصفر وجهه فقال ویحك ان ابیت الا ان تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شیء لیس فیه روح. (بخاری، رقم ۲۲۲۵)

''سعید بن ابی الحسن بیان کرتے ہیں کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا اے ابن عباس، میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے بس اپنے ہاتھ کے ہنر ہی سے روزی کمانی ہے۔ اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس ضمن میں تم سے وہی بات بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے کوئی تصویر بنائی، اللہ اس کو لازماً عذاب دے گا۔ یہاں تک کہ اس سے کہا جائے گا کہ اس تصویر میں روح پھونکو، لیکن وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ وہ شخص یہ سن کر ششدر رہ گیا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے (یہ دیکھ کر) کہا، تیرا ناس ہو، اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے، تو تو اس درخت کی بنا لے، تصویر بس اسی چیز کی بنایا کر، جس میں روح نہیں ہوتی۔''

ہمارے نزدیک ان روایتوں سے بھی جان دار کی تصویر کی حرمت کا مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

اولاً، اگر ان روایتوں کے الفاظ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں جان دار یا بے جان کا مسئلہ سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہاں حامل روح ہونے یا نہ ہونے یعنی زندہ ہونے یا نہ ہونے کی بات ہو رہی ہے۔ 'یقال لهم احیوا ما خلقتم ''ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے، اسے زندہ کرو''، 'حتی ینفخ فیها الروح و لیس بنافخ فیها ابدا ''حتیٰ کہ اس سے کہا جائے گا کہ اس تصویر میں روح پھونکو، لیکن وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک سکے گا'' کے جملے اسی حقیقت کو واضح کر رہے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ بے روح جمادات کو مورتوں میں تشکیل دے کر ان میں فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی روحیں ڈالنے کے زعم میں مبتلا ہیں، قیامت میں اللہ انھیں چیلنج کرے گا کہ ان میں فی الواقع روحیں ڈال کر دکھاؤ۔ گویا کہ اللہ فرمائے گا کہ میں نے مخلوقات کے اجسام بنائے، پھر ان میں روح پھونکی، پھر ان پر موت طاری کی اور ان کی روح قبض کی اور اب روز قیامت ان کے مردہ اجسام کو دوبارہ کھڑا کر کے ان میں از سر نو روح ڈالی ہے اور انھیں ایک مرتبہ پھر مردہ سے زندہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ تم بھی دنیا میں اس امر کا دعویٰ کرتے رہے ہو، اب یہ لکڑی، مٹی، پتھر اور سونے چاندی کی مورتیں تمھارے سامنے مردہ پڑی ہیں۔ اگر تمھارے دعوے میں حقیقت ہے تو ان میں روح پھونکو اور انھیں زندہ کر کے دکھاؤ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بخاری کی روایت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ بھی اسی بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے: 'الا ان تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شیء لیس فیه روح' ''اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے، تو تو اس درخت کی بنا لے، تصویر بس اسی چیز کی بنایا کر، جس میں روح نہیں ہوتی۔'' یعنی انھوں نے مصور کو سمجھایا ہے کہ جمادات میں سے جن اشیا کے ساتھ روح کا تصور وابستہ ہے، ان کی تصویریں نہ بنایا کر۔ جملے کے دروبست اور انتخاب الفاظ کی بنا پر قرین قیاس یہی ہے کہ سیدنا ابن عباس کے پیش نظر یہاں جان داروں یعنی حیوانات کا تذکرہ پیش نظر ہی نہیں ہے۔ اگر سیدنا ابن عباس کے پیش نظر یہی بات ہوتی تو وہ 'الا ان تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شیء لیس فیه روح' کے بجائے 'الا ان تصنع فعلیك بهذا الشجر کل

شیء لیس بحیوان ‘ کے الفاظ استعمال کرتے۔ عربی زبان میں بالعموم جان دار کے لیے حیوان اور بے جان کے لیے غیر حیوان یا جماد کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہا کے درج بالا اقتباسات میں بھی جان داراور بے جان کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے حیوان اور غیر حیوان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مزید براں حیوان یعنی جان دار کا تصور اگر ذہن میں ہو تو اس کے لیے لفظ ’شیء‘ بالعموم استعمال نہیں ہوتا۔ درخت کی مثال بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی انھوں نے کہا کہ اس درخت کی یا جمادات و نباتات میں سے ایسی چیز کی تصویر تو بنا لیا کرو جس میں روح متصور نہیں ہوتی، مگر ایسے جمادات کی تصویر نہ بنایا کرو جس میں روح متصور ہوتی ہے، جیسا کہ لات، منات اور عزیٰ کی پتھروں سے بنی ہوئی مورتیاں ہیں۔

ثانیاً، بخاری کی روایت کے وہ الفاظ جن پر مصور اور سیدنا ابن عباس کا پورا مکالمہ مبنی ہے، وہ یہ ہیں: ’انی اصنع ھذہ التصاویر‘ ’’میں یہ تصاویر بناتا ہوں‘‘۔ یہاں ’ھذہ‘ کا اسم اشارہ جن سامنے پڑی ہوئی تصاویر کی طرف ہے، انھی کے حوالے سے سیدنا ابن عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان کیا ہے اور انھی کے بنانے سے مصور کو منع کیا ہے۔ گویا اگر یہ متعین ہو جائے کہ وہ سامنے پڑی ہوئی تصاویر کون سی ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو روایت کے مدعا کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان الفاظ کو اگر روایت کے آخری الفاظ ’الا ان تصنع فعلیك بھذا الشجر کل شیء لیس فیه روح‘ ’’اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے تو اس درخت کی بنا لے، ہر اس چیز کی تصویر بنا لے جس میں روح نہیں ہوتی‘‘ کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ بات بہت حد تک متعین ہو جاتی ہے کہ ’ھذہ التصاویر‘ سے مراد وہ تصویریں ہیں جو ’لیس فیه روح‘ کے متضاد الفاظ ’کل شیء فیه روح‘ کا مصداق ہیں۔ یعنی وہ تصویریں مراد ہیں جن میں روح ہوتی ہے۔ مشرکین عرب کے نزدیک روح کی حامل تصاویر وہی تھیں جو لات، منات، عزیٰ اور دوسرے ناموں سے موسوم تھیں اور جن کے اندر روحیں تصور کی جاتی تھیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ساجد حمید

صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟

(۶)

ذہنی آزمایشیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حق پرستی

ہمیشہ حق پر قائم رہنا صبر ہے، بلکہ ہم نے یہ جانا کہ اصل صبر ہی یہی ہے۔اسی بات کی وضاحت پیچھے سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ یہاں ہم اپنی بات کو رائے کی حد تک محدود کریں گے۔اس لیے کہ ہم ذہنی آزمایشوں کے پہلو سے صبر کو دیکھ رہے ہیں۔ذہنی اعتبار سے یہ سب سے بڑی آزمایش ہے کہ آدمی اپنی رائے میں حق پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

انسان غلطی کا شکار ہوسکتا ہے۔اگر اس میں حق پرستی کا وصف نہ ہوتو وہیں چپک کر رہ جاتا ہے۔صرف حق پرستی ہی کا وصف ایسا ہے کہ اس کی غلطیوں کو دور کرتا اور اس کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ جولوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری رائے پختہ اور درست ہے وہ سب سے بڑی غلطی کا شکار ہیں۔یہی سب سے بڑی ناحق پرستی ہے۔انبیا کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے حق کے بارے میں غلطی نہ لگی ہو۔کوئی شخص بھی سو فی صدی درست نہیں ہے۔اس لیے ہر شخص کو ہر وقت اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ اس کی غلطی نکل سکتی ہے، مگر ہماری قوم کی تربیت ایسی ہوئی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس ان کے پاس جو کچھ ہے وہی مستند اور درست ہے۔

اس امت میں انبیا کے بعد ائمہ کو ایک بڑا مقام ملا ہے، انھیں امت کے بڑے بڑے گروہوں کی طرف سے قبولیت ملی ہے، مگر ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ چاروں ایک بات نہیں کہتے۔ یہ تو کبھی بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک وقت میں تین یا چار باتیں درست ہوں۔لازمی بات ہے کہ اختلافی آرا میں چاروں میں سے ایک صحیح اور باقی غلط ہوں گی۔اس بات سے ہم یہ سمجھ سکتے

ہیں کہ آدمی، خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو، اگر وہ نبی نہیں ہے تو اسے غلطی لگ سکتی ہے۔ اس لیے کہ نبی کو اپنی آرا میں اللہ کی وحی درست کرتی ہے۔

جو لوگ خود سوچ کر اپنی عقل و قیاس سے کام لیتے ہیں انھیں غلطی لگتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ہر بات کا دیانت داری سے جائزہ لیں۔ اسے پرکھیں، اس کے دلائل کا جائزہ لیں اور اگر اس میں غلطی نکل آئے تو اپنی رائے درست کر لیں۔

ہمارے گروہ

ہمارے معاشرے میں اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، اہل تصوف، شیعہ اور اس طرح کے کئی گروہ پائے جاتے ہیں جو دین کے بنیادی معاملات جیسے شرک و توحید سے لے کر فقہی و فروعی معاملات تک میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ سب درست ہوں گے۔ اگر یہ سب ہر مسئلے میں درست ہیں تو پھر دین اسلام نعوذ باللہ ایک چیستان ہوا۔ اور یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان میں سے صرف ایک گروہ پوری طرح صحیح ہے اور باقی تین چار گروہ مکمل طور پر غلط ہیں۔ اس لیے کہ ان سب کو دین صدیوں کے تعامل سے ملا ہے جس میں علما کی آرا بھی شامل ہوئی ہیں، ائمہ وفقہا کے فتاویٰ بھی، غیر مسلموں کے نظریات بھی، جیسے فلسفۂ یونان وغیرہ اور ظنی و قطعی ذرائع سے ملنے والا دین بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ آدمی کس کے ساتھ جڑے، کس کی بات مانے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے ہمیں کسی گروہ سے نہیں جڑنا، بلکہ ہمیں حق سے جڑنا ہے۔ جو انھی گروہوں کے پاس ہے، مگر اس میں ان گروہوں کے اپنے نظریات شامل ہو چکے ہیں۔ کسی نے اپنے نظریات ڈال دیے ہیں۔ کسی نے اپنی فقہ اور کسی نے اپنے فلسفے تراش لیے ہیں۔ کسی نے نئے منہاج دریافت کر کے اس میں داخل کر دیے ہیں اور کسی نے سارے دین کی مجموعی تعبیر ایسے کر دی ہے کہ دیکھنے میں تو دین ہی لگتا ہے، مگر وہ دین نہیں رہا۔

اس دور میں جبکہ باتیں ایک سے زیادہ ہو گئی ہیں اور گروہ بے شمار بن گئے ہیں تو اس میں صالح آدمی کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے کہ اس دین تک پہنچے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ بلاشبہ وہ انھی گروہوں کے پاس ہوگا، مگر سارا کسی ایک کے پاس نہیں۔ اس کا کچھ حصہ کسی کے پاس محفوظ ہے اور کچھ حصہ کسی اور کے پاس۔

مطلوب رویہ

دین کے اس دور میں ہمیں اپنے اپنائے ہوئے دین کو پرکھتے رہنا چاہیے۔ قرآن اور سنت متواترہ کو معیار بناتے ہوئے ایک ایک عمل کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ ایک ایک نظریے اور عقیدے کو پرکھ لینا چاہیے۔ ہر ہر گروہ سے رائے لینی چاہیے، ان کے دلائل کو جاننا چاہیے اور جس کی بات قرآن و سنت سے زیادہ قریب لگے اسے اپنانا چاہیے۔ جو لوگ دین میں ایسی مشقت

نہ کر سکتے ہوں انھیں کم از کم ایسا ضرور کر لینا چاہیے کہ وہ دو تین علما سے متعلق ہو جائیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہو کہ وہ قرآن وسنت کو سمجھنے والے ہیں اور دین کے ساتھ مخلص ہیں، مگر یہ فیصلہ محض جذبات اور اپنے کسی تعلق کی بنا پر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ نہایت دیانت داری سے اچھی طرح تول پرکھ کر ہونا چاہیے۔

حق پرستی کے لیے درج ذیل چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ اپنی آنکھیں اور دل و دماغ کو کھلا رکھنا چاہیے۔

۲۔ جب اپنی غلطی کا احساس ہو، اسے اچھی طرح تحقیق وجستجو کے بعد درست کرنا، اپنی رائے کو چھوڑنا اور درست کو اپنا لینا اور جو اس وقت درست رائے بنائی گئی اس آزمایش کے لیے بھی تیار رہنا کہ اس میں بھی غلطی نکل سکتی ہے۔ واضح رہے کہ اہل حق کی یہی سب سے بڑی آزمایش ہے۔

۳۔ اس سب کچھ کے بعد اگر آپ نے غلط رائے بھی نیک نیتی سے اپنا لی ہے اور اس کی غلطی معلوم ہونے پر ہر وقت اسے درست کرنے کے لیے تیار ہیں، تو پھر اگر خدا کے سامنے آپ چلے گئے اور غلطی پر بھی ہوئے تو آپ کو سزا نہیں ملے گی، بلکہ اجر ملے گا، لیکن اگر آپ نے نیک نیتی سے ایسا نہیں کیا، بلکہ کسی تعصب اور بد نیتی کی وجہ سے آپ نے رائے بنائی ہے تو یہ واپس کر دی جائے گی خواہ آپ کی رائے درست ہو۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسا کہ آپ بالکل درست طریقے سے نماز پڑھیں، مگر ریا کاری کر دیں، تو ثواب کے بجائے الٹے عذاب کے مستحق بنیں گے۔

لیکن اگر آپ نیک نیتی سے کھڑے ہوئے، جتنی نماز آپ کو آتی تھی صحیح پڑھی، مگر کہیں کوئی غلطی ہو گئی اور آپ کو پتا نہیں چلا، ہاں اگر آپ کو پتا چل جاتا تو آپ درست کرنے کے لیے تیار ہوتے تو یہ غلطی والی نماز کا بھی آپ کو ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ خطا ونسیان پر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ نہیں رکھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اعلیٰ اخلاق

ہم نے اخلاق کے چھ پہلو اوپر بیان کیے تھے:

۱۔ لین دین میں دیانت داری

۲۔ معاملات زندگی میں انصاف پسندی

۳۔ ملنے جلنے میں قول حسن پر عمل

۴۔ نیت کا مثبت ہونا

۵۔ ہر چیز کے مثبت رخ کو دیکھنا

۶۔ اپنی نگہ داری

پہلی تینوں چیزوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ہم عملی آزمایشوں والے باب میں اسے بیان کر چکے

ہیں۔ یہاں ہم ذہنی آزمایشوں والے حصے کو وضاحت سے بیان کریں گے۔

نیت کا مثبت ہونا

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر کام کے کرتے وقت اپنی نیت کو مثبت رکھیں یعنی صبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ارادوں اور نیتوں میں ہمیشہ مثبت پہلو سے آگے بڑھیں، مثلاً:

۱۔ کسی کے ساتھ معاملہ کریں تو اس میں خیر خواہی کی نیت ہو

۲۔ نیکی کا عمل کریں تو نیت آخرت کی کامیابی ہو

۳۔ دھوکے اور فریب کے لیے صبر اور درگزر نہ کریں، کہ اب معاف کر دیتے ہیں، کل اسے لوٹ لیں گے

۴۔ کسی کو بعد میں ستانے اور تنگ کرنے کے لیے اس کی مدد نہ کریں وغیرہ۔

ہر چیز کے مثبت رخ کو دیکھنا

اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کو دیکھنے کی نظریہ بنانی چاہیے کہ وہ لوگ انسان ہیں اور جس طرح ہم سے غلطی ہو جاتی ہے، ان سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کے ہر عمل کو اس وقت تک مثبت نگاہ ہی سے دیکھنا چاہیے، جب تک ان کا شر کھل کر سامنے آجائے۔ اگر آدمی کی یہ تربیت نہ ہوئی ہو تو اسے قرآن و حدیث بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ اس کی عادت باتوں کے غلط رخ کو دیکھنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس کا کوئی بھائی بند اس کے ساتھ نیکی بھی کرے تو اس میں سے بھی کسی ایسے پہلو کو نکال لیتا ہے جو منفی ہو۔ چنانچہ اس کے بارے میں قرآن کا حکم یہ ہے کہ لوگوں کے بارے میں بدگمانی نہ کی جائے (سورۂ حجرات)۔

قرآن مجید جیسی کتاب کو اگر غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ بھی ہماری گمراہی کا باعث بن جائے گی۔ جیسے قرآن مجید میں آنے والی مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ کَثِیْرًا، وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ. (البقرہ ۲:۲۶)

''اس (مثال) سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ گمراہ مگر ان فاسقین ہی کو کرتا ہے۔''

اس آیت میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ قرآن جیسی کتاب کے بارے میں بھی یہ بات خود قرآن ہی کہہ رہا ہے کہ ایک فاسق کے لیے یہ کتاب یا اس میں مثالیں جو اصلاً ہدایت کے لیے آئی ہیں، وہ گمراہی کا باعث ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاسق آدمی کے زاویۂ نگاہ سے بات کو سمجھا جائے تو قرآن کے نتائج اور ہیں اور اگر مومنانہ نگاہ سے قرآن کو سمجھا جائے تو اس کے ثمرات اور ہیں۔

یہی صبر کی آزمایش ہے کہ آپ اپنے زاویۂ نگاہ کو ہمیشہ درست رکھیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہر وقت اپنی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نگہ داری کریں۔

اپنی نگہ داری

اپنی نگہ داری سے ہماری مراد یہ ہے کہ آپ ہر وقت اپنے افعال و افکار پر نگاہ رکھیں کہ کہیں وہ جادۂ مستقیم سے ہٹتے تو نہیں پا رہے ہیں۔ اگر کوئی فلسفیانہ بحث، کوئی عملی مشکل، کوئی معما آپ کو غلط راستے پر ڈال رہا ہے تو اس پر غور کریں کہ یہ بات کیا ہے، جو میرے دل میں ابھر رہی ہے۔ اسے دبایے نہیں، بلکہ اسے ٹٹولیں، کریدیں، اس کو سمجھیں اور سمجھ کر متعین کریں کہ یہ کیا بات ہے۔ پھر اس کے سوال کا جواب تلاش کریں۔ اگر خود نہ ڈھونڈ سکیں تو علما اور سمجھ دار لوگوں سے مدد لیں، جو دین میں بصیرت رکھتے ہوں۔

اپنی نگہ داری کا دوسرا پہلو عمل سے متعلق ہے۔ ہم جو بھی عمل کرتے ہیں اس کے اثرات ہمارے دل و دماغ پر پڑتے ہیں۔ جو ہماری شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ اگر ہم اچھے کام کریں گے، تو ہماری نفسیات مستحکم اور صحت مند بنے گی۔ اگر ہم غلط راہوں اور عملوں میں پڑ گئے تو اس سے ہماری نفسیات پر برے اثرات پڑیں گے۔ یہ اعمال ہمارے تجربے کی صورت میں ہماری رائے پر بھی اثر انداز ہوتے اور ہماری عادات تخلیق کرتے ہیں۔ ایک آدمی گھر میں بیٹھ کر غلط سوچوں میں پڑا رہے تو باہر نکل کر اس کی نظر پاک نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح غلط عمل کرنے والے کا دماغ بھی صاف اور پاک باز نہیں ہو سکتا۔

آپ کو اپنی صحبت اور یاری دوستی کے لحاظ سے اپنی نگہ داری کرنی ہے۔ اچھی صحبت اچھے ذہن کو تخلیق کرتی ہے اور بری صحبت برے ذہن کو۔ اسی لیے قرآن میں ان لوگوں کے پاس بیٹھنے سے روکا گیا ہے، جو قرآن کی آیتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس لیے کہ اس سے وہی ذہن بنے گا جس کے اثرات ایمان و عمل، دونوں پر پڑیں گے۔

اس زمانے میں بعض دینی لوگ بھی ذہنی عیاشیوں کے لیے بعض ایسے لوگوں کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہیں کہ جہاں وہ نقطۂ آفرینی اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھاتے اور پھر آہستہ آہستہ غلط نظریات کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ پھر بات سمجھائے نہیں بنتی۔

اسی لیے امت میں شروع سے یہ نظریہ موجود رہا ہے کہ 'صحبت صالح ترا صالح کنند' کہ اچھی صحبت تجھے اچھا بناتی ہے۔ قرآن مجید نے جب بدووں کی طرف سے ایمان کی کمزوری دیکھی تو انھیں یہ مشورہ دیا کہ قول و فعل میں سچے لوگوں کی صحبت اٹھاؤ۔ چنانچہ فرمایا 'کونوا مع الصادقین' (توبہ ۹:۱۱۹) سچوں کی صحبت میں رہو۔ تاکہ تمھارے اندر بھی وہی دینی بصیرت پیدا ہو اور تم بھی ہر طرح کے حالات میں دین پر صبر و ثابت قدمی ظاہر کر سکو۔

صحیح عقیدہ

صبر کے لحاظ سے ایک ذہنی آزمایش یہ ہے کہ ہم ہر حالت میں اپنے عقیدہ کو درست رکھیں۔ مثلاً توحید یا خدا کی بندگی اور اسی سے استعانت طلبی ہمیشہ برقرار رہے۔ اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ وہ خدا سے مایوس ہو کر پیروں

فقیروں کے دروازے پر جاتے، درباروں پر نذرانے چڑھاتے، ان کے نام کی نیاز بانٹتے اور اگر ان سے بھی کام نہ بنے تو پھر ان کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ یہ سب بے صبری ہے۔ اس سے آپ کا عقیدہ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ شرک ہے کہ آپ یہ مانیں کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا ہے جو خدا کے فیصلوں کو تبدیل کرا سکتا ہے۔ یہ خدا کی صفات کا انکار اور اس کی ذات کی اہانت ہے۔

اسی طرح محبت رسول میں لوگوں کے ہاں غلو وجود میں آتا ہے اور وہ اللہ اور نبی میں فرق مٹا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ عیسائیت کا نقطۂ نگاہ ہے۔ اسلام میں نبی کو اللہ یا اس کا بیٹا نہیں مانا جاتا، مگر ہمارے عقیدے اسی قدر خراب ہو چکے ہیں۔ ہم انسانوں کو خدا کا تقدس دیتے اور یوں شرکاے خدا کی ایک لمبی فہرست پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ نظریات ہمارے اسی طرح کی ضرورتوں سے پھوٹے ہیں جن میں ایک اولاد کے نہ ہونے کا ہم نے ذکر کیا۔ اسی طرح ایک چیز دوزخ کا خوف اور ہماری بے عملی ہے۔ اس نے ان شرکاے خدا کو وجود بخشا ہے، جو ہمارے شفاعتی بنیں گے۔ چنانچہ جب وہ آخرت میں شفاعتی بنیں گے تو یہاں اس دنیا میں بھی یہ تصور وجود میں آیا کہ وہ دنیا میں بھی خدا کے فیصلوں کو بدل سکتے اور انھیں ہمارے حق میں تبدیل کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو تصوف میں قطب وابدال بنایا، ان کے درباروں اور مزاروں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ وہ پوجے گئے، ان سے استعانت طلب کی گئی اور خدا کی راہ میں انفاق کے بجائے ان کے نام کے نذرانے اور نیازیں بٹیں۔ یہ سب استقامت وصبر کے منافی ہے۔

آزمایش خواہ کیسی بھی کیوں نہ ہو اس میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے (الحجر ۱۵: ۵۶)۔ خدا سے مایوس ہوئے بغیر اس کی رضا پر راضی رہنا اس معاملے میں صبر ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مویدات صبر

اس باب میں ہم ان چیزوں سے بحث کریں گے، جو ہمیں صبر کرنے میں مدومعاون ہیں:

اللہ اور صبر

صبر کے بارے میں ہم اوپر یہ پڑھ آئے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا صحیح ہوگا، صبر کے حصول میں اتنا ہی مددومعاون ہوگا۔ صحیح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ تعلق صحیح رخ میں اور پورے شعور کے ساتھ ہو۔ صحیح رخ کے معنی یہ ہیں کہ ہم خدا کو اچھی طرح جان کر اس کے ساتھ تعلق بنائیں۔ جیسے دنیا میں اگر ہم انسانوں کو صحیح نہ پہچانیں تو ہم ان سے بسا اوقات نقصان اٹھا بیٹھتے ہیں۔ ٹھیک ایسے ہی اگر ہم نے خدا کو صحیح نہ پہچانا تو ہم خدا سے ایسی غلط توقعات پر بیٹھے رہیں گے جنھیں پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات اور حکمتوں کے خلاف ہو۔ اس لیے ہمارے خدا کے ساتھ صحت مندانہ تعلق کے

لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی صفات اور سنن کو جان کر اس کے ساتھ تعلق استوار کریں۔ تاکہ غلط توقعات اور غلط نظریات کی بنا پر ہمارا تعلق ناقص بنے اور عین اس وقت شکستہ ہو جائے جس وقت ہمیں اس تعلق کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔

اس بات کو ہم ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے۔ اور اپنے تصورات کے مطابق اس زعم میں رہے کہ ایسی ریاضت کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد اسی طرح آتی ہے جس طرح ابراہیم پر آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے اللہ کی مدد آئی۔ اور اس طویل ریاضت کے دوران میں انھوں نے خدا سے کوئی چیز طلب نہیں کی۔ تاکہ وہ ایسے کسی موقع پر اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مدد مانگ سکیں۔

چنانچہ ایک دفعہ یوں ہوا کہ باد و باراں کا نہایت سخت طوفان آیا، جس کے نتیجے میں سیلاب آ گیا۔ سارا گاؤں غرقاب ہو گیا۔ لوگ بچنے کے لیے لکڑی، شہتیر اور ہر طرح کی چیزوں سے مدد لینے لگے، مگر ان بزرگوں کے نزدیک یہی موقع تھا کہ وہ اپنی ریاضت کا فائدہ حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور پکارے کہ اے اللہ آج تو خود مجھے آکر بچائے گا۔ میں کسی چیز کی مدد حاصل نہیں کروں گا۔ بارش ہوتی رہی اور وہ بزرگ پانی میں خدا کے ہاتھ کا انتظار کرتے رہے۔ ایک شہتیر تیرتا ہوا ان کے پاس سے گزرا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر اسے نہ روکا کہ آج اللہ مجھے بچائے گا۔ میں اس کی مدد نہیں لوں گا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بھینس تیرتی ہوئی آئی۔ وہ اس پر بیٹھ کر بھی بچ سکتے تھے، مگر انھوں نے کہا آج اللہ مجھے بچائے گا اتنے میں پانی ان کی گردن تک آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے کچھ لوگ کسی تختے پر تیرتے ہوئے آئے، انھوں نے کہا بابا جی آ جاؤ، مر جاؤ گے، مگر بابا جی نے مسکرا کر سوچا، آج مجھے اللہ بچائے گا۔ پھر انھوں نے تختے پر تیرنے والوں کو ان کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں پانی ان کے سر تک پہنچ گیا۔ پھر فوجیوں کی ایک کشتی تیرتی آئی، انھوں نے بابا جی کی لاش کو اٹھایا اور پانی سے باہر لے آئے۔ اس قصہ سے بات واضح ہوئی کے خدا کے ساتھ تعلق ایسی توقعات پر وابستہ کر کے بنایا گیا کہ جو اس کی سنت اور صفات کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ اس دنیا کو پردۂ غیب میں رہ کر چلا رہا ہے، اس لیے وہ کسی کی اپنے ہاتھ ظاہر کر کے مدد نہیں کرتا، نہ کرے گا۔ وہ تختہ، شہتیر، تیرتی ہوئی بھینس ہی ''اللہ کے ہاتھ'' تھے جن کو تھام کر باہر آنا چاہیے تھا۔

اللہ علیم و حکیم ہے

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سارے کام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ جذبات کے تحت نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی شکل و صورت اور حسب و نسب دیکھ کر فیصلے نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنے علم اور حکمت کے پیش نظر یہ سب کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے کسی رسول کی امت میں سے ہونا یا کسی کی اولاد ہونا، اس بات کی کسی کو مستحق نہیں بناتی کہ وہ ہمارے ساتھ ان چیزوں کی بنا پر کوئی معاملہ کرے۔ ایسا وہ اپنے علم، حکمت اور دانائی کی بنا پر کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com

علیم

اللہ صاحب علم ہے۔ دنیا میں ہونے والا ہر واقعہ ازل سے اس کے علم میں ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز حادثہ نہیں ہے۔ وہ غیب اور ظاہر، دونوں کو جانتا ہے۔ یہاں ایک بات ضمناً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس سے کسی بھی حالت میں جدا نہیں ہوتیں۔ ٹھیک اسی طرح اس کی صفت علم بھی ہر وقت اس میں موجود رہتی ہے۔ چنانچہ جب ہم پر کوئی مصیبت اتری ہو تو یہ ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ اس سے بے خبر ہوگا یا یہ کہ اسے تو اس کا علم نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمارا یہ نظریہ کہ وہ ہر واقعے کو جانتا ہے، ہمارے لیے باعث تسلی واطمینان اور سہارا بننا چاہیے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ جب ہمارے اوپر کوئی مصیبت و مشکل آئے تو یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ ہمارا مالک و آقا اس سے بے خبر ہے۔ اب ہمارا پرسان حال کوئی نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس یہ خیال کرنا چاہیے کہ دنیا ہماری اس مصیبت سے بے خبر ہے، مگر وہ کارساز اس سے واقف ہے جس نے اسے اس مصیبت سے نکالنا ہے۔

جب آدمی کو مصیبت کے وقت یہ یاد رہے کہ اس کی مشکلات دور کرنے والا اس کی مصیبت سے باخبر ہے تو یہ اس کے لیے ایک بڑا سہارا ہے جو اسے بلا معاوضہ اور بلا انقطاع میسر رہتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ وہ ہماری صلاحیتوں، ہماری افتاد طبع، ہماری دلی خواہشات اور ہمارے حالات کا نہایت باریکی سے علم رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہمیں کسی مشکل میں ڈالے گا تو ان تمام پہلوؤں سے وہ مشکل آزمایش نہایت نپی تلی اور متوازن ہوگی۔ اگر ہم صحیح ذہن کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں، تو ہم بلا شبہ آزمایش کی اس بھٹی سے کندن بن کر نکلیں گے۔ اور صبر بھی ہمارے لیے آسان تر ہوگا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہم خدا کی نظروں میں ہیں

یہ دنیا اللہ نے بنائی ہے، وہ اسے چلا رہا ہے۔ اس کی نگاہ مسلسل اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی مصیبت زدہ ہو اور اللہ اس سے واقف نہ ہو۔ (۴۸:۵۲) نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی ظلم کر رہا ہو اور اللہ اس سے بے خبر ہو۔ اس لیے اس بات سے پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ اگر ہم مظلوم ہیں تو ہماری دادرسی نہیں ہوگی، یا ہوگی تو حاکم کی بے خبری کی وجہ سے پوری پوری دادرسی نہ ہو سکے گی، کوئی کمی رہ جائے گی۔ بے صبرا تو اس کو ہونا چاہیے جسے دادرسی کی امید نہ ہو، یا جو بے انصافی کی توقع رکھتا ہو۔ مثلاً اگر کسی نے میرے بھائی کو قتل کر دیا ہے تو وہ آج تو قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے، لیکن خدا کی پکڑ سے کیسے بچ سکتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ اس زمین و آسمان کی حدود سے بھاگ کر کیسے نکل جاؤ گے۔ آخر تم سب آہستہ آہستہ اپنے رب کی طرف کھنچے جا رہے ہو اور ایک دن اس کے سامنے کھڑے ہوگے۔ اس دن خدا کا سامنا ہر کسی نے کرنا ہے۔ آدم و حوا کے زمانے سے لے کر قیامت سے پہلے پیدا ہونے والے آخری آدمی تک نے یہ دن دیکھنا ہے اور اس میں جو کچھ اس نے کیا ہے، اسے بھگتنا

ہے۔اس دنیا میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ظلم و ،انصافی ہو،خواہ اس کی کمیت واہمیت ذرہ برابر ہو،وہ بھی سامنے آئے گی۔اور اس پر آپ کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔قیامت کے بارے میں قرآن کی یہ تصریح کہ اس دن خیر وشر میں اگر کسی نے ایک ذرہ برابر عمل بھی کیا ہے تو اسے دیکھے گا۔(سورہ زلزال ۹۹) یعنی اس سے اجر و گناہ پائے گا۔ہر مظلوم کے لیے خوش خبری ہے اور ہر ظالم کے لیے ایک وعید و دھمکی۔جس مظلوم پر یہ حقیقت منکشف ہو،وہ اپنے ظالموں سے بدلہ لینے کے لیے کیوں کر حدود سے تجاوز کرے گا اور اسے بدلہ لینے کی ایسی جلدی بھی نہیں ہوگی کہ ماورائے عدالت انتقام لیتا پھرے۔غرض یہ احساس کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں،وہ ہر وقت میری ہر حالت سے واقف ہے،یہ چیز ہمیں ایک نوعیت کا اطمینان عطا کرتی ،اور ہمیں بے صبری سے روکے رکھتی ہے۔

حکیم

اللہ صاحب حکمت ہے۔دنیا میں ہونے والا ہر واقعہ اس کی دانائی ،بصیرت اور اس کے حکیمانہ مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ مصیبت کتنی بڑی ہے، بلکہ اس پر ہونی چاہیے کہ یہ کیوں آئی ہے۔اس لیے کہ اس حکیم و خبیر سے یہ توقع نہیں کہ وہ بلاوجہ ہمیں کسی ابتلا میں ڈال دے گا وہ یقیناً درج بالا مقاصد ہی کے لیے ہمیں آزماتا ہے۔اس کے حکیم ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ہر کام کو حکمت پر مبنی سمجھا جائے اس لیے کہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اس کی یہ صفات اس سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہوتیں۔اس لیے یہ جان لینا چاہیے کہ اگر وہ کسی کو سزا بھی دے رہا ہوتو وہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

اس کو ہم ایک ادنیٰ درجے پر ماں کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں، جو اپنے بچے کو بدتمیزی کرنے یا محنت نہ کرنے پر صرف اس لیے سزا دیتی ہے کہ اس کی عادتوں کا بگاڑ اس سے دور ہو، یا اس کا مستقبل تاریک نہ ہو۔ماں کے ذہن کی یہ حکمت بعض اوقات بیٹے سے اوجھل ہوتی ہے اور وہ ماں سے باغی ہو جاتا ہے، جو کہ جائز نہیں ہے۔اگر ماں اپنے بیٹے پر یہ ستم اس لیے توڑتی ہے کہ وہ سدھر جائے ،اس کا مستقبل سنور جائے ،وہ آنے والے دنوں میں پریشان نہ ہو تو کیا خدا ماں سے زیادہ حکیم نہیں ہے؟ اور وہ اس سے زیادہ مستقبل سے باخبر نہیں ہے؟ یہی اس کا علیم و حکیم ہونا ہے جو ہمارے لیے باعث اطمینان ہے۔

اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ بسا اوقات ہم یہ خیال کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا کاروبار چل جانا چاہیے،ہمیں ملازمت مل جانی چاہیے، ہمارے اولاد ہونی چاہیے،لیکن معاملہ اس کے برعکس رہتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا علم یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے لیے مستقبل میں نقصان کا باعث ہوگا۔وہ ہمیں اس نقصان سے بچانے کے لیے اس سب کچھ سے محروم رکھتا ہے۔

اللہ رؤف و رحیم ہے

مشکلات میں ہمیں جو چیزیں صبر کے لیے بدرقہ فراہم کرتی ہیں ان میں سے اللہ کی دو صفات: رؤف و رحیم ہیں۔

رؤف

’رؤ ف ‘اس ذات کو کہتے ہیں، جو دوسروں کی مشکلات دور کرنے والی، ان کو کلفتوں سے نکالنے کا اہتمام کرنے والی ہو۔ جبکہ ’رحیم ‘ اس ذات کو کہتے ہیں، جو عنایت و مہربانی کرنے والی ہو، لوگوں کے لیے استحقاق یا بلا استحقاق نعمتیں نازل کرنے والی ہو۔ گویا رحمت عام ہے اور رافت خاص، جو اس وقت متحرک ہوتی ہے، جب آدمی مشکل میں گھرا ہوا ہو۔

اس صفت کے تذکرے سے جو باتیں میں سامنے لانا چاہتا ہوں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت یہ تو ہے کہ وہ مشکلات میں سے نکالتا ہے، لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ مشکلات میں ڈالتا ہے۔ البتہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بھوک، جان جانے کے خوف اور نقص اموال سے ہماری آزمایش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم ایسی ذات کے بارے میں جو رؤف و رحیم ہے، ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ وہ خواہ مخواہ ہمارے اوپر مصائب نازل کرتا رہتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ جب بھی ہمیں مشکل میں ڈالتا ہے تو وہ محض مشکل میں ڈالنے کے لیے ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے ہماری بھلائی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو حقیقت میں رافت کا تقاضا یہی ہے۔

قرآن مجید میں یہ صفت ’و اللّٰہ رؤف بالعباد ‘(اللہ اپنے بندوں کے لیے رؤف ہے۔) کے الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب نہایت درجہ دل نواز ہے۔ اسی طرح یہ صفت ’ان اللّٰہ بالناس لرؤف الرحیم ‘ کے الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ سورۂ بقرہ (آیت ۱۴۳) میں یہ صفت جہاں آئی ہے، وہ مقام اس صفت کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے۔ اس لیے ایک نظر اس مقام پر ڈال لینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں اللہ تعالیٰ نے تبدیلی قبلہ کا حکم دے کر اس متوقع ردعمل کا ذکر کیا ہے، جو بالخصوص یہود کی طرف سے سامنے آنے والا تھا۔ وہ صدیوں سے بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوئے تھے۔ اب اس قبلہ سے ہٹنا ان کے لیے بہر حال ایک دشوار کام تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیتے ہی فرمایا ہے کہ اللہ نے یہ حکم امت مسلمہ کو کاملاً دین ابراہیمی پر قائم کرنے کے لیے دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ یہ پرکھے کہ کون رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں واپس چلا جاتا ہے۔

اس حکم کے یہ دونوں مقصد بتانے کے بعد فرمایا کہ بلاشبہ یہ کام مشکل ہے، لیکن ہم نے یہ حکم اس لیے نہیں دیا کہ ہم تمھارا ایمان ضائع کر دیں۔ اللہ تو لوگوں کے ساتھ رؤف و رحیم ہے۔

یہاں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ تبدیلی قبلہ جیسی ایک بڑی آزمایش میں ڈالنے کے بعد، جس کے مشکل ہونے کو خود رؤف و رحیم نے تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ میں رؤف ہوں اس لیے تم پر ایسی آزمایش نہیں ڈالوں گا جس کی وجہ سے تم ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ اسی اصول کو اس نے ایک عمومی اصول کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے کہ ’لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعہا ‘(اللہ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ آزمایش کا بوجھ نہیں ڈالتا)۔ یہاں اس وسعت سے مراد قوت برداشت

ہے، یعنی آدمی پر ایسی آزمایش نہیں ڈالی جائے گی کہ اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہو جائے اور وہ کفر پر مجبور ہو کر ایمان سے محروم ہو جائے۔ اگر اللہ ایسی آزمایش آدمی پر ڈال دیں تو یہ اس کے نزدیک قرین انصاف نہیں ہے کہ وہ اس پر گرفت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی طرح، پاگل اور بے ہوش آدمی کے جرائم کا مواخذہ نہیں ہے۔

خدا کی توجہ مقصد تخلیق پر

دوسری بات رافت کے پہلو سے سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ رؤف ورحیم کی نظر تخلیق آدم کے اس مقصد پر رہتی ہے کہ اس نے اسے آزمایش کے لیے پیدا کیا ہے، نہ کہ اس دنیا میں ہمیشہ کی زندگی گزارنے کے لیے، جبکہ ہم اکثر اوقات اس حقیقت کو فراموش کیے رہتے ہیں۔

وہ ایک ہمدرد ماں کی طرح جو اپنے نالائق بچے کے مستقبل سے پریشان رہتی ہے، اسے کبھی ڈانٹتی ہے کبھی کوستی ہے، کبھی پیار سے بہلاتی پھسلاتی ہے، کبھی لالچ دیتی اور کبھی سزا کی وعید سناتی ہے۔ ذرا اس نگاہ سے ان آزمایشوں کو دیکھیے اور سوچیے کہ وہ کتنا پیار کرنے والا، کتنا خیر خواہ اور کس قدر مشکلات سے نکالنے والا ہے۔

وہ اس نادان ماں کی طرح (نعوذ باللہ) نہیں ہے، جو اپنے بچے کو اس لیے چلنا نہیں سکھاتی کہ کہیں گر کر اسے چوٹ نہ آ جائے۔ وہ جہاں جاتی ہے اسے گود لیے رہتی ہے۔ بظاہر وہ بیٹے کی ہمدرد ہے، لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ اپنے بیٹے کی دشمن ہے۔ اسے بیٹے کے ان دنوں کی پروا نہیں ہے، جب وہ اسے گود میں اٹھا کر کہیں نہ لے جا سکے گی۔ پھر یہی بیٹا اسے گالیاں دے گا کہ تو نے مجھے چلنا کیوں نہیں سکھایا؟ تم نے میرے ساتھ یہ دشمنی کیوں کی؟ اور وہ اسے یہ نہ کہہ سکے گی کہ میں نے تو تمھاری ہمدردی کی تھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جس ماں نے اپنے بیٹے کو پاؤں پر چلنے کے لیے مشکلات میں نہیں ڈالا، وہ اس وقت ہمدرد نظر آتی تھی، مگر وہ حقیقت میں ''رؤف'' نہیں تھی اور جس نے اپنے بیٹے کو بچپن میں مشکل میں ڈالا، وہ اس وقت سخت نظر آتی تھی، مگر حقیقت میں وہ ''رؤف'' و ہمدرد تھی۔

ہم چونکہ بچوں کی طرح اپنے ''مستقبل'' کو اکثر فراموش کیے رہتے ہیں، اس لیے ہمیں وہ ''ماں'' اچھی لگتی ہے، جو ہماری ''آج'' کی راحت کا خیال رکھتی ہے، جبکہ دور اندیش آدمی کو وہ ''ماں'' اچھی لگے گی، جو اس کے ''کل'' کی راحت کو بھی ملحوظ رکھے۔ اللہ ایسی ہزار ماؤں سے بھی زیادہ ہمدرد ہے۔ اس لیے مشکل سے مشکل وقت میں بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ یقیناً ہمیں ''پاؤں پر چلنا'' سکھا رہے ہیں، اور سیکھنے کے دوران میں ٹھوکریں تو ہمیں لگیں گی۔

رحیم

ایک نظر اب 'رحیم' کی صفت پر بھی ڈال لیجیے۔ 'رحیم' اس ذات کو کہتے ہیں جو عنایت و مہربانی کرنے والی ہو،

لوگوں کے لیے استحقاق یا بلا استحقاق نعمتیں نازل کرنے والی ہو۔ رحمت کے چند اہم پہلو سمجھنا حصول صبر کے لیے نہایت ناگزیر ہے۔ رحمت اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے کہ اس سے بعض مکاتب فکر نے عجیب وغریب فلسفے تراش رکھے ہیں، جس کی وجہ سے بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کی نفی ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بااصول ذات ہے بھی یا نہیں؟ آئیے اب رحمت کے حوالے سے چند باتیں سمجھ لیں:

سزا اور مشکلات رحمت کا حصہ ہیں

رحمت کو ایک اور پہلو سے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ عام تصور اس کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں صرف عنایت وشفقت ہی شامل ہے، لیکن قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سزا بھی رحمت کا لازمی حصہ ہے۔ اس کے بغیر رحمت کا تصور تکمیل نہیں پاتا۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کریں، ایک ماں کے دو بیٹے ہیں۔ ایک شرارتی ہے اور دوسرا شریف اور سیدھا سادھا ہے۔ شریر بچہ کسی موقع پر شریف کو تنگ کرتا ہے تو ماں جو دونوں بیٹوں کی یکساں ماں ہے، وہ اس طرح کے موقع پر ہمیشہ یہ نہیں کر سکتی کہ اپنے شریف بچے کو دلاسا دے کر چپ کرا دے، بلکہ اسے شریر بچے کو سزا بھی دینا پڑتی ہے تاکہ شریف بچے کا دل ٹھنڈا ہو اور اسے محسوس ہو کہ جو اس کی شرارت سے اس نے تکلیف اٹھائی تھی، اس کی سزا اسے مل گئی۔ اگر وہ ماں ایسا نہ کرے تو وہ شفیق ماں نہیں ہے۔ ماں کے اس رویے سے معلوم ہوا کہ شفقت ایک بچہ کی سزا کے بغیر تکمیل نہیں پاتی۔

ٹھیک اسی اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (الانعام ۶:۱۲)

''اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، اس لیے وہ ضرور قیامت کے دن تمھیں جمع کرے گا۔''

ناانصافی رحمت کے خلاف ہے

یہاں دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اکٹھا کر کے حساب کتاب کو اپنی رحمت کا تقاضا قرار دیا ہے۔ رحمت کا یہی وہ اصول ہے، جس سے عدل پھوٹتا ہے۔ چنانچہ ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ معاشرے میں ہونے والے جرائم کی سزا دی جائے تاکہ مجرمین کے لیے عبرت کے ساتھ ساتھ، مظلوم کی دادرسی بھی ہو۔ قرآن مجید نے قوم قریش کے انجام بد کی خبر دی تو فرمایا:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ. (التوبہ ۹:۱۴)

''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دینا چاہتا ہے، وہ انھیں شکست و رسوائی سے دوچار کرے گا اور تمھیں غلبہ و نصرت سے اور اس طرح مومنین کے سینے ٹھنڈے کرے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مراد یہ ہے کہ سزا کی تکمیل صحابہ کے سینوں کی ٹھنڈک کے بغیر نامکمل ہے۔ سورۂ انعام میں یہی وجہ ہے کہ کفار کی جڑ کٹنے پر اللہ کا شکر ادا کیا گیا ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (الانعام ۶: ۴۵) ''سو، اللہ پروردگار عالم کا شکر ہے کہ ظلم کرنے والوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔''

ظاہر ہے کہ شکر کا حقیقی موقع رحمت وعنایت ہے، اسی لیے یہاں اس عنایت پر خدا کا شکر کیا گیا ہے کہ دنیا ان لاخیروں سے پاک کر دی گئی۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ جب ہم پر کوئی مشکل نازل ہو، تو اسے رحمت الٰہی کے خلاف نہ سمجھیں۔ اس موقع پر وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو بیماری کے موقع پر تجویز فرمایا تھا کہ اس بیماری کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھو۔

جیسے ہم نے عرض کیا کہ اللہ کی کوئی صفت کسی وقت بھی اس سے جدا نہیں ہوتی، اس لیے خیال رہنا چاہیے کہ اس کی صفت 'رحمة' اس کی صفت 'قائم بالقسط' سے جدا ہو کر عمل نہیں کرتی، بلکہ وہ جب رحم کرتا ہے، تو کبھی بھی انصاف اور قسط کے خلاف نہیں ہوتا۔

اس کو ایک تمثیل سے سمجھیے: ایک آدمی پر اللہ کی ہر عنایت لگتا ہے کہ آسمان سے براہ راست برس رہی ہے۔ دنیا کی کوئی نعمت نہیں جو اس کے گھر میں نہ ہو، مگر اس کا کردار اور اس کا عمل نہایت سرکشی اور نہایت دین ناپسندی، بلکہ کفر کا ہے تو کیا اس پر اللہ کی رحمت قرین انصاف ہے؟

ہر آدمی جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے فطرت ودیعت ہوئی ہے۔ جس میں نیکی کا شعور اور اس کی حلاوت اس کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اس لیے یہ دنیا طلب آدمی بھی نیکی کرتا ہے۔ اگرچہ وہ دنیا میں شہرت پانے یا محض قلبی تسکین کے لیے کرتا ہے۔ تو 'انما الأعمال بالنیات' کے اصول پر اسے دنیا میں اس کا اجر ملنا چاہیے۔ اگر انھیں دنیا میں اجر نہ ملے، اور آخرت میں بھی ان کی ان نیکیوں کا اجر نہ ملے تو یہ ناانصافی ہوگی۔

اس لیے اسے یہ اجر مختلف صورتوں میں دے دیا جاتا ہے: کسی کو معاشرے میں بلند منصب عطا کر کے، کسی کو شہرت یا دولت دے کر اور کسی کو گرو اور پیشوا بنا کر، کسی کو مقتدر اور فرعون بنا کر، غرض جو صورتیں اس دنیا کے تنگ نائے میں ممکن ہیں، ان سب صورتوں میں کسی کی نیکی کے مطابق اسے اجر مل جاتا ہے۔ اس طرح ایک نیکی گویا ایک تدبیر کا درجہ پا کر آخرت تک جانے سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نیکی اس طرح کرتے ہیں کہ انھیں دنیا ہی میں اجر مل جائے تو انھیں یہ اجر دنیا ہی میں مل جائے گا۔ البتہ آخرت میں ان کے حصے کچھ نہیں آئے گا۔ اس لیے دیکھیے کہ ایک بے انصافی والی ''رحمت'' کتنا بڑا انصاف

ہے۔

خدا کا رنگ تخلیق

یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے جس طرح بنائی ہے، وہ دراصل جوڑے کے اصول پر بنائی ہے۔ یہاں ہر چیز ناقص ہے اور اسے اس کا جوڑا مکمل کرتا ہے۔ مثلاً ہم رات میں آرام کر سکتے ہیں، مگر کام پوری طرح نہیں کر سکتے۔ دن میں کام بھرپور طریقے سے کر سکتے ہیں، مگر آرام نہیں کر سکتے۔ چنانچہ رات دن، مرد و عورت، زمین و آسمان، خوشی و غم، آرام و تکلیف غرض ہر ہر پہلو سے دیکھیں تو خدا کی یہ کاری گری ہمیں نظر آئے گی کہ اس نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے، جو ایک دوسرے کے نقص کو پورا کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے خیر و شر کا جوڑا بھی بنایا ہے۔ یعنی نیکی بھی ہے اور بدی بھی، غم بھی ہے اور خوشی بھی۔ یہ چاروں چیزیں ہماری آزمایش ہی کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس دنیا میں غم، مصیبت، نقصان، موت اور دیگر تکالیف ایسی آزمایش ہیں کہ ہمیں ان پر صبر کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی راحت، چین، نفع، زندگی اور خوشیوں کا جوڑا ہیں۔ جس طرح ہم نے اوپر جانا کہ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر مکمل ہوتی ہے، اسی طرح خوشی اور غم بھی ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔

یہ دنیا چونکہ آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ اس لیے نہ اکیلا غم اس آزمایش کو صحیح معنی میں آزمایش بناتا ہے اور نہ اکیلی خوشیاں۔ یعنی اگر یہاں غم ہی غم ہوتا اور خوشی کا تصور ہی نہ ہوتا، تو انسان کے لیے غم کی آزمایش بے معنی ہو جاتی، اسے تکلیف ضرور رہتی، مگر راحت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس آزمایش میں ایسا نقص آ جاتا ہے کہ غم کی حالت وہی ہو جاتی ہے، جو اس وقت ہماری محدودیت کی ہے۔ یعنی، مثلاً ہم اڑ نہیں سکتے تو اس کی نہ ہمیں کوئی آزمایش محسوس ہوتی ہے اور نہ اس کا غم و قلق ہمیں ستاتا ہے۔ تکلیف اگر لازمی حصہ ہو جائے، راحت نہ رہے تو اتنا بڑا خلل واقعہ ہوتا ہے کہ کائنات ہی نامکمل سی دکھائی دیتی ہے۔

اس لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غم و رنج کا آنا شکوہ و شکایت کے لیے نہیں ہے، بلکہ نعمتوں کے احساس، ان کی اہمیت جتلانے، اور ہمیں آزمانے کے لیے ہے۔ تمام مصائب کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ مصیبت میں گم ہو جانے کے بجائے اسے سمجھ کر اس میں کامیاب ہو کر نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اصل حیثیت آخرت کی کامیابی کو حاصل ہے

ہم اس دنیا میں عرصۂ دراز سے ہیں۔ اور ہم صدیوں کے اس سفر میں یہاں رہنے کے ایسے عادی ہوئے ہیں کہ اسے ہم نے اپنی منزل ہی سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں ہمیشہ جینا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی ہر شے کو زوال ہے اور خود ان زمین و آسمان کو جو محکم و ثابت نظر آتے ہیں، ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ اس لمبے عرصہ میں ہم یہ بھول چکے ہیں کہ ہمیں آخرت میں خدا کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چنانچہ انسان اس نسیان کی وجہ سے اپنی منزل کو بھول کر راستے ہی کو منزل سمجھ لیتا ہے۔ جبکہ اسے آخرت کی تیاری کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنی ساری مساعی اسی دنیا کو بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ اللہ تعالیٰ کو نسیان لاحق نہیں ہوتا، اس لیے وہ مسلسل ہماری آخرت کے لیے تیاری کے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہم ایک مشکل، جو بلاشبہ سنگین ہوسکتی ہے، پر روتے رہتے ہیں، جبکہ آخرت کی ناکامی سے بڑی مصیبت کوئی نہیں ہے۔ ہمیں اگر وہ پریشانی یاد ہو تو ہمیں دنیا کی مشکلات کبھی اتنا پریشان نہ کریں اگر ہم انھیں اپنا زادِ سفر بنا لیں۔

اس لیے اللہ کے نزدیک اس دنیا کی بڑی سے بڑی تنگی بھی دوزخ کی تنگی سے بڑی نہیں ہے۔ کسی عورت پر ظلم ہونا، اسے طلاق ہو جانا، کسی عورت کا بے اولادی کی وجہ سے بے گھر کیا جانا، ساس اور بہو کے جھگڑوں میں اس پر الزام لگنا، کسی کا کاروبار ٹھپ ہو جانا، اگر کسی کو ان میں سے گزر کر جنت ملنے والی ہو، تو اللہ کے نزدیک یہ معمولی باتیں ہیں۔

وہ جانتا ہے کہ ایک بیوہ، ایک مطلقہ یا ایک الزام زدہ عورت یا ظلم وستم کا ستایا ہوا کوئی آدمی، جو بھی ان آزمایشوں میں کامیاب ہو کر جنت میں آ جائے گا، وہ ان مشکلات کو اپنے لیے نعمت سمجھے گا، کیونکہ اگر وہ مشکلات اس پر نہ آتیں تو وہ دوزخ کی مصیبت سے نجات نہ پا سکتا۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے جس ماں کے تین بچے مر گئے، اور وہ صابر وشاکر رہی تو یہ غم اس کے جنت میں جانے کا سبب بن جائیں گے۔

اس کو بھی ماں ہی کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ ماں جب اپنے بچے کو چھری چاقو سے کھیلتے ہوئے دیکھتی ہے، تو اس سے وہ چاقو چھین لیتی ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ جانتی ہے کہ اس وقت چھری سے محروم ہونا اتنی بڑی تکلیف نہیں ہے، جتنی بڑی تکلیف اسے اس چھری سے ہاتھ کٹ جانے کی وجہ سے ہوگی۔ اس لیے وہ بچے کے چیخنے اور چلانے کے باوجود اس سے چھری چھین لیتی ہے۔ اور اگر وہ چپ نہ کرے تو وہ اسے مزید ڈانٹ بھی دیتی ہے۔

اس سے ہمیں اللہ کی پے در پے آزمایشوں کا بھی ایک سبب معلوم ہو جاتا ہے کہ جب ہم اللہ کی کسی آزمایش پر صحیح رویہ اختیار نہیں کرتے، تو وہ ہمیں مزید ڈانٹتا ہے تاکہ ہم سنبھل جائیں۔

خدا کی ربوبیت اور اس کا حکیمانہ کنٹرول

ہم بالعموم ان مشکلات پر زیادہ غضب ناک ہوتے ہیں، جو ہمارے دوستوں یا عزیز رشتہ داروں کے کسی اقدام کی وجہ سے ہم پر آتی ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں چغلی، غیبت، ٹانگ کھینچنا، دھوکا دہی، زر اور زمین کے جھگڑے ایسے عام جرائم ہیں کہ آدمی ان سے پریشان ہو کر دوستوں سے جھگڑ پڑتا، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کر لیتا، ان کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہو جاتا، ماں باپ کو گھر سے نکال دیتا، حتیٰ کہ بعض اوقات انھیں یا اپنے آپ کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سارے جھگڑوں کو آزمایش کے طور پر نہیں لیتا۔ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ اپنی پوری آزادی سے کر رہے ہیں، اس لیے اگر میں انھیں ختم کر دوں، ان سے ناتا توڑ لوں، ان کو گالیاں دے لوں، ان کو ماروں

پیٹوں،تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ ایسے اقدامات کے بعد مزید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایسا شخص اصل میں اللہ کی ربوبیت اور اس کی حکمت کا انکار کرتا ہے۔قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر اوراس کے حکیمانہ فیصلوں کے خلاف روبہ عمل نہیں ہوتا۔ جب صورت حال ایسی ہے تو کیا یہ رشتہ دار، یہ غیبت و چغلی کرنے والے جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں آیا خدا کی مہلت کے بغیر کر رہے ہیں؟

اگر ہم یہ انکار کر دیں کہ وہ اللہ کی دی ہوئی مہلت کے بغیر ایسا کر رہے ہیں تو یہ خدا کی الوہیت وحکیمانہ کنٹرول کا انکار ہے،اور اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اللہ ہی نے مہلت دی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ کی یہ مہلت بلا وجہ نہیں ہوگی۔اس کے پیچھے مذکورہ مقاصد میں سے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پیش نظر ہو گا،یعنی ہماری اصلاح، ہمارے گناہوں کو جھاڑنا وغیرہ۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اب اپنے ان ساتھیوں کی کارگزاری کو دیکھیے تو جو گناہ وخطا وہ کر رہے ہیں، وہ اگرچہ اپنی مرضی سے کر رہے۔اس سے وہ یقیناً گناہ کما رہے ہیں،لیکن مہلت چونکہ اللہ نے دی ہے اس لیے وہ ہماری تربیت اور آزمایش کا سامان بھی کر رہے ہیں۔

وہ ہمارے اوپر ظلم ڈھانے جیسا کبیرہ گناہ کر رہے ہیں،مگر ہمارے لیے صبر کرنے کی صورت میں جنت کی راہ کھول رہے ہیں۔ابولہب اور ابوجہل کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے ایک طرف ان کے لیے دوزخ تعمیر کی تو دوسری طرف صحابہ رضوان اللہ علیہم کے کردار کی تعمیر کی۔ وہ جیسے جیسے یہ حرکتیں کرتے گئے صحابہ کا ایمان مضبوط ہوتا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام ایسی حکمت اور تدبیر سے بنایا ہے کہ ایک شر بھی وجود میں آتا ہے تو سوخیر اپنے دامن میں لے کر آتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس نکتہ کے حل ہونے کے بعد جب میں اپنے گردونواح میں لوگوں کو اپنے اوپر الزام دیتے، طعنے دیتے،طرح طرح کی سازشیں کرتے دیکھوں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں انھیں اپنا دشمن قرار دوں،میرے تو وہ محسن ہیں دشمن تو وہ اپنے ہیں۔ وہ میری تربیت کا سامان اپنا نقصان کر کے کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کو طعنے کا جواب دینے کے بجائے مجھے ان کی اصلاح کا سوچنا چاہیے۔ان پر ترس آنا چاہیے کہ وہ اپنی تباہی کے گھڑے کھود کر مجھے ان میں اترنا اور اتر کر نکلنا سکھا رہے ہیں۔

لیکن مجھے یہ فائدہ بس اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ جب میں ان کی ان حرکات کو اللہ کی آزمایش سمجھ کر اسے اپنی تربیت و اصلاح کا ذریعہ بناؤں۔اگر میں نے ان کی اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھا کے دے مارا تو میں بھی ان جیسا ہوں۔ میں نے بھی غلطی کا ارتکاب کر ڈالا ہے۔اس کے بعد خیر کا دروازہ میرے لیے بند ہو جائے گا۔

حدیث میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ملتا ہے کہ کوئی صاحب ان کو گالیاں دیتے رہے اور کچھ دیر تک ابوبکر چپ رہے، لیکن کچھ دیر بعد انھوں نے بھی جواب دینا شروع کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر آپ نے انھیں بتایا کہ جب تک تم خاموش رہے تو فرشتے جواب دیتے رہے، اور جب تم جواب دینے لگے تو وہ چلے

گئے۔ ایک طرح سے اللہ ان کی طرف سے دفاع کرتا رہا۔ فرشتوں کا جواب دینا غیر مسموع تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ گالیوں کے جواب میں کیا جواب دیتے رہے ہوں گے، لیکن وہ جو کچھ تھا وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک خیر تھا، جس سے وہ جواب دینے کے بعد محروم ہو گئے۔

ٹھیک اسی طرح کی محرومی کا شکار ہم ہو جاتے ہیں، جب ہم برائی کے جواب میں برائی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کی برائی کا ان سے بدلہ جائز اور عادلانہ طریقوں سے لے سکتے ہیں، لیکن انھیں معاف کرنا 'حظ عظیم' کا پانا ہے۔

قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ تم کسی کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو۔ اس کے الفاظ ہیں کہ تم کسی کی برائی کو نیکی سے دھکیل کر ہٹا دو۔ بجائے اس کے کہ تم بدی کو دھکیلنے میں بدی ہی کی راہ اختیار کرو تو یہ تمھیں اللہ کی عنایتوں سے محروم کر دے گا۔ اگر تم اس کی راہ میں زندگی بسر کرو اور لوگوں کی برائی کا دفاع نیکی سے کرو تو اس سے نہ صرف یہ کہ تمھارا دشمن تمھارا عزیز دوست بن سکتا ہے، بلکہ تم بھی وہ خوش قسمت بن جاؤ گے جنھیں خدا اپنی حکمتوں سے نوازتا ہے۔ دیکھیے قرآن مجید نے اس رویہ کو ایک بڑی خوش بختی قرار دیا ہے اور اسے صبر کا ثمرہ قرار دیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ. وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ. (حم السجدہ ۴۱: ۳۴-۳۵)

''نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم برائی کا احسن چیزوں سے دفاع کرو، تو تم دیکھو گے کہ وہ جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہی تمھارا گرم جوش دوست ہو گا۔ مگر یہ وہ دانش مندی ہے، جو صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اور یہ صرف ان کو ملتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وعدۂ الٰہی

حصول صبر کے لیے ایک بنیادی چیز یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھیں۔ جس طرح ہم نے صفات الٰہی میں جانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہمارے لیے صبر کے حصول کا ذریعہ ہیں، اسی طرح اللہ کے وعدے بھی ہمارے لیے ایک سہارا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کچھ وعدے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے ہیں کچھ وعدے صرف صحابہ رضوان اللہ علیہم سے کیے ہیں اور کچھ وعدے بنی نوع آدم سے کیے گئے ہیں۔ جیسے نیکی کرنے اور برائی سے بچنے پر جنت کا وعدہ، آزمایشوں میں ثابت قدم رہنے پر ایمان ضائع ہونے سے بچانے کا وعدہ، کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کا وعدہ، اسی طرح برائی کرنے پر دوزخ کی سزا کا وعدہ وغیرہ۔

'وما صبرك الا بالله' میں اللہ کے یہ وعدے بھی شامل ہیں جو ہمیں صبر کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ قرآن مجید جب یہ کہتا ہے

کہ تم اللہ کے بغیر صبر نہیں کر سکتے، تو جس طرح اس کی ذات، اس کی صفات، جیسا کہ ہم اوپر پڑھ آئے ہیں، ہمارے لیے ایک سہارا ہیں، ٹھیک ویسے ہی یہ اس کے وعدے بھی ہمارے لیے سہارا ہیں۔

یہ وعدے مشکلات اور آزمایشوں میں ہمارے لیے اس لیے سہارا ہیں کہ جب ہمیں مشکل کام کرنا پڑے تو ہم انھی وعدوں کے بل پر مشکل کے باوجود نیکی کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ہمیں خدا کی طرف سے دادرسی اور انعام کی توقع نہ ہو تو شاید ہر قدم پر نیکی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ اگر جنت اور دوزخ کا تصور نہ ہو تو شاید انسانوں کی نہایت ہی قلیل تعداد دنیا میں نیکی پر قائم رہے۔ اس لیے کہ انسان اپنی طبیعت میں مقصد کے لیے جینے والا ہے۔ اگرچہ اکثر وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔

انسان امید کے سہارے بہت کچھ کر لیتا ہے۔ نیکی کے میدان میں یہ امید خدا کے وعدوں سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ ان سہاروں سے جو امید پیدا ہوتی ہے وہ شب و روز کی کلفتوں میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح ہماری 'تیمارداری' کرتی ہے۔ مسیحا بن کر ہمارا علاج کرتی ہے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ اطمینان عطا کرتی ہے۔ اور ہم اس اطمینان کے سہارے راہ حیات پر چلتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اس ایمانی قوت سے محروم ہیں، وہ اس امید اور ان سہاروں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتے اور کچھ لوگ خود کشی تک کر لیتے ہیں، اور کچھ دوسروں کو قتل کر بیٹھتے اور بعض نفسیاتی امراض کا شکار ہو کر بے موت مر جاتے ہیں۔ یہ بے امیدی، ذہنی دباؤ، غم و غصے اور مایوسی (depression) کے ساتھ ساتھ بے چینی، بے صبری، بے اطمینانی و بے کلی (frustration) کا شکار کر دیتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آزمایش کی حکمتوں کا علم

قرآن مجید نے آزمایشوں کے آنے کے جو اسباب بیان کیے ہیں، ان کے علم سے بھی آدمی کو صبر حاصل ہوتا۔ اس لیے کہ یہ علم آدمی کو وجوہات بتا کر تسلی دیتا ہے اور تسلی کی وجہ سے اسے صبر آ جاتا ہے۔ (اس موضوع پر ہم نے الگ سے ایک رسالہ بعنوان: 'ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں' تحریر کیا ہے۔ جسے آپ دیکھ سکتے ہیں۔) یہ علم اللہ تعالیٰ کی سنت ابتلا سے متعلق ہے۔ اور ابتلا یا آزمایش اس دنیا کی حقیقت ہے۔ جس کے صحیح تصور کے بغیر یہ دنیا نہ سمجھ میں آنے والا معما ہے۔

چنانچہ یہ علم اگر ذہن سے اتر جائے تو اس کو تازہ رکھنا چاہیے اور اس مقصد سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔ اسی طرح اس موضوع پر اہل علم کی تحریروں کا مطالعہ بھی ایک حد تک مفید رہے گا۔ البتہ قرآن مجید کے مطالعے سے ہماری مراد اس کی تلاوت نہیں ہے، بلکہ اس کو سمجھ کر پڑھنا مطلوب ہے۔ اس لیے کہ سمجھے بغیر اس کی تعلیمات سے آگاہی ناممکن ہے۔

نماز (بالخصوص تہجد)

قرآن مجید کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، بالخصوص تہجد کی نماز، حصول صبر کا ایک نہایت مفید ذریعہ ہے۔

سورۂ مزمل میں آیا ہے کہ تہجد کی نماز دل جمعی اور قول کی پختگی کے لیے بہت مفید ہے۔ یعنی تہجد کی نماز پانچ وقت کی نماز سے زیادہ موثر ہے اس لیے کہ زیادہ گہرائی اور توجہ سے پڑھی جاتی تھی۔ اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ قرآن ٹھہر ٹھہر کر، یعنی اسے سمجھ سمجھ کر پڑھا جائے۔ تاکہ تہجد اپنا کام اپنی کامل صورت میں کر سکے۔

سورۂ مزمل میں قرآن مجید نے اس نماز کی حقیقت دو لفظوں میں بیان کی ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا. (۸:۷۳)

''اپنے رب کا ذکر کر اور اس کی طرف خلق سے کٹ کر گوشہ گیر ہو جا۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تہجد ادا کرنے کے لیے فرمایا گیا تھا، تو اس کے جو آداب آپ کو سکھائے گئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ اسے یاددہانی اور ذکر کا ذریعہ بنائیں اور اس کے ذریعے سے خدا کے دامن رحمت میں گوشہ گیر ہو جایا کریں۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس حکم کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''... یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا طریقہ بتایا کہ جب جب لوگوں کی دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامن رحمت میں گوشہ گیر ہو جایا کرو۔ اور اس کے لیے تمھیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ تم اس کے نام کو یاد کیا کرو۔ تو وہ خود تمھیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات ہی کی تعبیر ہیں اور ان صفات ہی پر تمام دین وشریعت اور سارے ایمان وعقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم مستحضر رہے تو آدمی کی پشت پر ایک ایسا لشکر گراں اس کے محافظ کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہوں میں پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔

اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے، جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خرمن پر گرتی نظر آتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۲۷-۲۸)

یہی وہ ذکر ہے جس سے خدا کے دامن رحمت میں گوشہ گیری کی راہ کھلتی ہے۔ ان صفات کی یاد ایک حصار کی طرح ہمارے گرد محافظ بن کر موجود رہتی ہے۔ جیسے ایک بچہ کسی خوف ناک چیز سے ڈر کر اپنی ماں کی گود میں پناہ گیر ہو کر ساری دنیا کے خوف و دہشت سے بے نیاز ہو جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی ایک بندہ اس یاد کے تازہ ہونے کے بعد خدا کے دامن رحمت میں چھپ کر سارے غم بھول جاتا ہے۔ طرح طرح کے حملوں سے اپنے آپ کو مامون خیال کرتا ہے۔

نماز کا یہی پہلو ہے کہ اگر اسے نماز میں پیدا نہ کیا جائے تو نماز اپنے اثرات پیدا نہیں کرتی۔ پھر اس کے بعد آدمی طرح

طرح کے مصنوعی سہارے تلاش کرتا ہے، اسے ان کا نشہ تو لگ جاتا ہے، مگر مسئلے حل اور غم دور نہیں ہوتے۔

نماز، عہد بندگی کی یاد

نماز عہد عبودیت کی یاد ہے، جو صبر کو تقویت دیتی ہے۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ 'اقم الصلوٰۃ لذکری' میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ خدا کی یاد عہد بندگی کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ یہ آدمی کو بتاتی ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے جو آزمایشوں میں اس لیے ڈالا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک صالح بندۂ خدا ثابت کرے۔ یہ چیز اس کی غفلت و نسیان کو دور کرتی ہے، جس میں پڑ کر وہ بے صبرا ہو رہا تھا۔ اس یاد کے تازہ ہونے سے وہ ایک حقیقت شناس بن کر اٹھتا ہے۔ حقیقت اس پر روشن ہوتی اور اس ادراک حقیقت سے اس پر اپنا مقام کھلتا اور وہ ایک تازہ دم سپاہی کی طرح میدان عمل میں دوبارہ کود جاتا ہے۔

قیام، رکوع اور سجدہ بتدریج آدمی کی غفلت کو دور کرتے ہیں۔ قیام میں خدا کا کلام اسے کچھ حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ رکوع اسی بندگی و سرفگندگی کے جذبے کا اولین اظہار ہے، جس کے بعد سجدہ اس کی آخری شکل ہے۔ یہ تینوں اعمال ہم نمازوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ کرتے ہیں۔ جو ہمیں یاد دلاتے اور حقیقت شناس بناتے ہیں۔

نماز قرب الٰہی کا سبب

اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تہجد خدا کی رحمت میں گوشہ گیری کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ یہ گوشہ گیری دراصل خدا سے تعلق کا ایک پہلو ہے۔ نماز خدا کے ساتھ تقرب کا تعلق پیدا کرتی ہے۔ سورۂ علق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ 'واسجد واقترب' 'سجدہ کرو اور خدا کے قریب ہو جاؤ'۔ یہ قربت اگرچہ غیر محسوس ہے، اور ہم اس کی کیفیت و ماہیت کو سمجھ نہیں سکتے، لیکن یہ قرب یقیناً خدا کی پناہ کے لیے ایک استعارہ ہے۔ اس قرب کے معنی یہ بھی ہیں کہ نماز حصول صبر میں استعانت کرتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حمد و تسبیح

قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکلات کے وقت کئی بار حصول صبر کے لیے نماز کا حکم تسبیح و تحمید کے الفاظ میں دیا ہے۔ اگرچہ یہاں نماز ہی کا حکم دیا گیا ہے، مگر یہ بات واضح ہے کہ نماز کا یہ حکم اس کی دو خاصیتوں کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔ نماز کے یہ دو پہلو ایسے ہیں کہ جو معنوی یا ذہنی اثرات رکھتے ہیں۔ اگر ہم نماز میں تسبیح و تحمید کو سوچ سمجھ کر اختیار کریں تو اس کے کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ یہ نتائج ہمارے لیے صبر کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ ان دونوں خاصیتوں کے معنی اور اثرات کا جائزہ ہم اگلی سطور میں لیں گے۔

تسبیح

جس کے معنی یہ ہیں کہ خدائے واحد کی پاکی بیان کی جائے۔ پاکی بیان کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ مانا جائے کہ اللہ کے کسی فعل اور فیصلے میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ جب اللہ کے فیصلے میں کوئی غلطی نہیں ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہمیں پھر یہ تکلیف میں

کیوں ڈالا گیا ہے۔ ہمیں بھوک، خوف اور موت کی کسی آزمایش میں ڈالا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ جب اس کا فیصلہ غلط نہیں ہے، اور وہ ہمارے اوپر مصیبت نازل کر رہا ہے تو یہ بات واضح ہے کہ پھر اس کے پیش نظر کوئی مقصد ہو گا۔ اور وہ مقصد یہی ہے کہ اللہ نے ہمیں آزمانے کے لیے یہ مشکل بھیجی ہے۔

تسبیح کا یہ تصور ہمارے زاویۂ نگاہ کو بدلتا ہے۔ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ تم یہاں کچھ پانے کے لیے آئے ہو۔ اس لیے اللہ ہمیں آزماتا ہے۔ اور آزمانے کے لیے جیسی آزمایش ہونی چاہیے ویسی وہ نازل کرتا ہے۔ میرا آپ کا ہر عمل خدا کی منشا و اذن سے دوسروں کے لیے آزمایش بنتا ہے۔ اسی طرح دوسروں کا ہر عمل ہمارے لیے آزمایش بنتا ہے۔ اسی وجہ سے دین کا مطالبہ دوسروں کی برائی پر یہی ہے کہ ہم صبر کریں۔ جو آدمی ایسے مواقع پر صبر نہیں کرتا، اور انتقام لے لیتا ہے تو اگر اس نے انصاف سے انتقام لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے مواخذہ تو نہیں کریں گے، مگر درحقیقت اس نے دنیا داری والا معاملہ کیا ہے۔ دین کا تقاضا پورا نہیں کیا۔ اس لیے وہ بڑے خیر سے محروم رہ جائے گا۔

حمد

حمد تسبیح کا دوسرا رخ ہے۔ تسبیح یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال میں کوئی عیب نہیں ہے، اور حمد یہ بتاتی ہے کہ ساری اچھی صفات اس میں ہیں۔ اس کے تمام افعال اور اوصاف خیر ہیں۔ اس سے جو بھی عمل، چیز اور خیال وجود میں آتا ہے، وہ خیر ہے۔ ہمارے اوپر آنے والی آزمایش، مصیبت، ظلم سب خیر ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لیے کہ ایک پہلو سے وہ آپ کے لیے ایک مشکل سوال ہے، جس کا امتحان میں آپ کو جواب دینا ہے اور دوسری طرف وہ ایک نرسری ہے، جس کی پنیری سے خالق کائنات خیر کی پرورش کرتا ہے۔ مثلاً جس آدمی کا بیٹا سرکش و بدقماش ہو، اس کی موت ماں باپ کے لیے مصیبت ہے، مگر معاشرے کے لیے خیر ہے۔ اس اصول سے ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کائنات جس اصول پر بنی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر چیز دوہرے رخ کی ہے اس کا ایک رخ اچھا ہے اور دوسرا بظاہر برا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اپنے نتائج کے اعتبار سے اچھے ہیں۔

خالق کائنات شر کی کوکھ سے خیر پیدا کرتا ہے۔ سورۂ کہف میں مذکور ایک نوجوان کی کشتی کا ٹوٹنا بظاہر ایک برا حادثہ ہے، مگر حقیقت میں وہ ایک خیر کو وجود میں لاتا ہے۔ ہر حادثہ، خواہ اس کا خیر ہمیں فوراً نظر آئے یا نہ آئے، دراصل خیر کو پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ایک آدمی کا مرنا، کاروبار میں کساد کا آنا، بیماری کا لاحق ہونا، ذہنی اذیت سے دوچار ہونا، گھر سے نکالا جانا، غرض سب حادثات ہیں، ان کا ظاہر برا ہے، مگر ان سب سے خیر برآمد ہوتا ہے۔

اسے ہم ایک حقیقی مثال سے سمجھتے ہیں۔ میرے پاس ایک قضیہ آیا کہ ایک گھر میں چار پانچ بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بھائی ان میں سے بیاہا ہوا تھا۔ باقی سب کنوارے تھے۔ جو بیاہا ہوا تھا بس وہی کماتا تھا۔ باقی سب پڑھے لکھے تھے، مگر آرام طلبی کی بنا پر کمانے نہ جاتے تھے۔ یا پھر کوئی وجہ تھی۔ ان کی بھابی سب کے کام بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کرتی اوران کی جلی کٹی بھی سنتی تھی۔کوئی تیسرے چوتھے سال اس کی بیوی نے انصاف کا تقاضا کیا۔دونوں میاں بیوی کے خیال میں مسئلہ کا حل صرف یہ تھا کہ وہ الگ ہوجائیں،مگر وہ بھائیوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔اس لیے کہ ایک تو کماتے نہیں تھے،دوسرے ان کے گھر سنبھالنے کے لیے بیویاں بھی نہیں تھیں۔

کسی کے کہنے پر وہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ بھائیوں کو بھی بلاؤ۔پہلے تو راضی نہیں ہوئے،مگر میرے اصرار پران کو لایا گیا۔میں نے سب لڑکوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپیں اور بڑے بھائی کو الگ ہوجانے کا مشورہ دیا۔یہ ان لڑکوں کے لیے ایک ناگہانی مصیبت ضرور تھی،مگر میں نے انھیں بتایا کہ تمھارے لیے بالآخر باعث خیر ہوگی۔ان کے لیے بڑے بھائی سے ایک ماہ کا خرچہ بھی دلا دیا،یوں انھیں ایک مہینے کے اندر اپنے لیے روزگار بھی حاصل کرنا تھا،اور گھر کے سارے کام بھی۔چنانچہ وہ بھائی اور بھابھی جس کو انھوں نے اپنے غلام بنا کر رکھا ہوا تھا،وہ ایک نعمت گم گشتہ بن گئے۔ایک مہینے کے اندر ہی ان بھائیوں میں سے ایک کو ملازمت تو مل گئی،مگر گھر کے کام کر کے انھیں احساس ہوا کہ ان کی بھابھی نے کیا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔غرض انھیں اندازہ نہیں تھا کہ کس نعمت کو پا کر وہ ناشکرے بنے رہے۔ان کے دلوں میں بھائی اور بھابھی کی محبت جاگنے لگی،ان کا احترام پیدا ہوا اور سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی وہ سب کمانے لگ گئے۔ان کی آرام طلبی آہستہ آہستہ رخصت ہوگئی۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوئی کہ بھائیوں کے لیے بڑے بھائی کا چھوڑ کر چلے جانا ان کے لیے اصلاح کا باعث بنا۔یعنی ایک مصیبت بظاہر مصیبت تھی،مگر ان کے مستقبل کے لیے ایک نوید تھی،جس نے انھیں نکمے انسانوں کے بجائے کام کرنے والے لوگ بنایا۔اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا،اس لیے کہ انھوں نے ایک ڈیڑھ سال ہی مجھ سے رابطہ رکھا۔اس لیے کہ پہلے وہ مجھ سے شاکی تھے پھر مطمئن ہوئے،تو ظاہر ہے اطمینان کے بعد لوگ سب بھول جاتے ہیں۔

یہ مثال خدا کے سزاوار حمد ہونے کی طرف رہنمائی کرتی ہے،یعنی اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں شر کے پیدا ہونے کا جو امکان رکھا ہے،وہ بھی اس لیے کہ اس سے خیر برآمد ہو۔قرآن مجید میں جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں صاحب اقتدار بنانے کا اعلان کیا تو فرشتوں کو اس اقتدار کا منفی رخ سامنے آیا تو انھوں نے خدا سے کہا کہ ہم تو آپ کو سزاوار تسبیح وتقدیس سمجھتے ہیں،پھر آپ کے شایان شان یہ نہیں کہ آپ اس دنیا میں کوئی ایسا کام کریں کہ جو شر کو وجود بخشے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا کہ میں جس صاحب اقتدار کو وجود بخش رہا ہوں صرف شر ہی پیدا نہیں کرے گا،بلکہ اس کی نسل میں بہت زیادہ اخیار اور صالحین بھی ہوں گے۔

اس قصے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی تقدیس اور خطا سے اس کا منزہ و پاک ہونا اس سے ختم نہیں ہوتا کہ وہ شر کو کسی خیر کے لیے وجود میں آنے دے۔اس لیے ہمیں صرف اس وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں مصیبت لاحق ہو گئی ہے،بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے ہمارے لیے خیر برآمد ہوگا۔اس خیال کے ساتھ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی امید قائم رہتی ہے۔آدمی کے حوصلے قائم رہتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تقدیر پر ایمان

قرآن مجید کا فرمان ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر ٹھہرائی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے راستے پر چلا دیا۔ گویا آدمی نیکی اور بدی جو کماتا ہے وہ تو اپنی آزادی اور اختیار سے کماتا ہے، لیکن جو مقام اور مرتبہ اسے حاصل ہوتا ہے، جو مال و دولت اسے حاصل ہوتی ہے وہ اس کی تقدیر کا لکھا ہوا اسے ملا ہے۔ اس لیے نہ اسے غربت پر کڑھنا چاہیے اور نہ اپنی دولت و عزت پر نازاں ہونا چاہیے۔

یہ سب کچھ ایسا ہی ہے، جیسے اچھی اور بری صورت والا ہونا۔ نہ اچھی صورت تکبر و غرور کی وجہ ہے اور نہ بڑی سے بڑی مشکل مایوسیوں کا باعث۔ یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر ہے جو اس نے اپنی خاص حکمتوں کے ساتھ ٹھہرائی ہے، جن میں کچھ حکمتوں کو ہم نے اوپر سیکھا ہے۔ آدمی کی شکل و صورت، اس کی صلاحیتیں، اس کا مال و دولت، سب کا تعلق اس کی قسمت سے ہے نہ کہ اس کے ذاتی استحقاق اور اس کی قابلیت کا صلہ اور حق۔ اس لیے ان کا ہونا یا نہ ہونا منشاے الٰہی ہے، جس کا مقابلہ حوصلہ اور دانش مندی سے کرنا چاہیے۔

پائی ہوئی نعمتوں کا تذکرہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اگر کوئی مشکل آدمی پر آئے تو آدمی کو اچھے دنوں کو یاد کرنا چاہیے جن میں اللہ نے اس پر عنایتیں کی ہوتی ہیں۔ اور یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر اللہ نے وہ دن دکھائے تھے اور گزر گئے تو یہ دن بھی باقی نہیں رہیں گے، یقیناً اچھے حالات نصیب ہوں گے۔ اس سے بھی آدمی کو صبر اور تسلی حاصل ہوتی ہے۔ سورۂ الم نشرح میں یہی طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

حصول صبر کے اوپر بیان کردہ یہ تینوں طریقے اصل میں خدا کے ساتھ آدمی کے تعلق کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ آدمی کا یہ شعور جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی اس کا خدا سے تعلق گہرا اور مستحکم ہوگا۔ اور جتنا اس کا تعلق اس سے گہرا ہوگا اسی قدر وہ مشکلات میں صبر کر سکے گا۔

لیکن ہم ان نعمتوں سے حقیقی معنی میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے اگر ہم ان مشکلات میں اللہ سے طالب مدد نہ ہوں۔ اللہ سے مدد، بعض تصورات کے صحیح کیے بغیر، طلب کرنا بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے اور بسا اوقات بے معنی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کو صحیح کر لیا جائے۔

آخرت پر ایمان

صبر پیدا کرنے والے امور میں یہ بھی ہے کہ آدمی کا ایمان آخرت پر بہت پختہ اور یقین کی حد تک ہونا چاہیے۔ آخرت پر ایمان صبر پیدا کرنے والے امور میں سب سے بڑا امر ہے۔ آخرت کا عقیدہ ہمیں وہ نظر عطا کرتا ہے، جس سے ہم چیزوں کو

ایک اور ہی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔یعنی اس نگاہ سے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہ نظریہ کئی کاموں سے ہمیں روکتا اور کئی کاموں پر ابھارتا ہے۔اسی طرح ہماری آزمایش کو قدرے آسان کرتا ہے۔ہم چونکہ غم و راحت اور نفع ونقصان کو ایک امتحانی سوال کی طرح دیکھنے لگ جاتے ہیں، اس لیے ان کی کیفیت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔آخرت کو نہ ماننے والا جہاں رو رہا ہوتا ہے، آخرت کو ماننے والا وہاں سے کامیابی کے راستے ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔اس کی نظر اگلے منافعوں پر ہوتی ہے، جبکہ آخرت کے منکر کی نگاہ وقتی فائدوں پر۔

آخرت ایک ابدی بادشاہی کا نام ہے (طہٰ ۲۰:۱۲۰) جس میں نعمتوں کو زوال نہیں ہے۔ جو مل گیا وہ ہمیشہ کے لیے مل گیا۔ ہم آپ کو اسی منزل کا سچا راہی بننا چاہیے۔ اور جب کبھی اس منزل کو بھولنے لگیں تو فوراً یاددہانی حاصل کریں، اپنے اردگرد تواصی بالحق کا ماحول بنائیں، جہاں آپ دوسروں کو اور دوسرے آپ کو حق بات کی نصیحت کریں کہ کل تم قیامت کے دن کیا کرو گے۔اسی نصیحت سے صبر حاصل ہوگا۔

تواصی بالحق (یاددہانی)

قرآن مجید نے سورۂ عصر میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپ ایک دوسرے کو نصیحت کریں حق کی اور اس پر قائم رہنے، یعنی صبر کی۔اس حکم کی وضاحت کرتے ہوئے استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

> ''اس کام (تواصی بالحق و بالصبر) کی جو نوعیت ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے، اس سے یہ واضح ہے کہ دعوت کی اس صورت میں داعی اور مدعو الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص جس طرح داعی ہے، اسی طرح مدعو بھی ہے۔قرآن مجید نے اس کے لیے 'تواصوا' یعنی ایک دوسرے کو نصیحت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، بیوی کو شوہر کے لیے اور شوہر کو بیوی کے لیے، بھائی کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا چاہیے۔ وہ جہاں یہ دیکھے کہ اس کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلاف حق طریقہ اختیار کیا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد وصلاحیت کے مطابق اسے راستی کی روش اپنانے کی نصیحت کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ صبح ہم کسی کو کوئی حق پہنچائیں، اور شام کے وقت وہ ہمارے لیے یہ خدمت انجام دے۔آج ہم کسی کو کوئی نصیحت کریں، اور کل وہ ہمیں کسی حق کی تلقین کرے۔غرض یہ کہ جب موقع میسر آئے، ہر مسلمان کو اپنے دائرۂ عمل میں یہ کام لازماً انجام دیتے رہنا چاہیے۔'' (میزان ۲۱۳۔۲۱۴)

یہ عمل اگر ہمارے ماحول میں عام ہو جائے تو ہمیں ہر وقت یاددہانی کرانے والے میسر رہیں گے۔ یاددہانی دراصل ہمیں آخرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔آخرت کا سبق اگر ہمیں ہر وقت یاد رہے تو یہ ہمارے لیے حصول صبر کا باعث ہے۔اسی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وجہ سے قرآن مجید نے 'تواصی بالحق ' کے فوراً بعد' تواصی بالصبر ' کا ذکر کیا ہے کہ اس' تواصی بالحق ' والے فرض کی ادائیگی کے ساتھ ہی یہ عمل بھی وجود پذیر ہوگا۔ جس طرح نماز کی یاددہانی فحشا ومنکر سے روکتی ہے اسی طرح حق بات اور آخرت کی یاددہانی ہمیں منکرات سے روکتی ہے۔ منکرات سے رکے رہنا ہی صبر ہے۔ چنانچہ حصول صبر کے خواہش مند اپنے ماحول میں تواصی کو زندہ کریں، اس سے حصول صبر میں بہت مدد ملے گی۔

انفاق فی سبیل اللہ

نیکیوں پر قائم رہنے میں معاونت کرنے والی چیز اللہ کی راہ میں انفاق بھی ہے۔ یہ انفاق زکوٰۃ اور فطرانہ وغیرہ کی صورت میں تو ہر مسلمان کرتا ہی ہے، مگر کچھ اس کی لازم صورتیں عام مسلمانوں کو معلوم ہی نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کے بعد ان کی اصل ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اب جو بھی وہ خرچ کریں گے وہ نفلی ہے۔ اس پر ہمارا مواخذہ نہیں ہوگا۔

یہ علم کی کمی ہے۔ دراصل زکوٰۃ کے علاوہ بھی انفاق کی کچھ شکلیں ایسی ہیں کہ جو ہم پر لازم ہیں۔ ان میں مقدار اور وقت متعین نہیں ہے، لیکن یہ بات لازم ہے کہ اس میں دینا ناگزیر ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ انفاق کا ایک سادہ اصول ہے کہ ہمارے مال میں اللہ تعالیٰ نے محروم اور سائل کا حق رکھا ہے۔ جو لوگ محروم ہوں ان کی مدد کرنا اور جو دروازے پر آجائیں ان کو دینا، ہمارے مالوں میں سے حق مقرر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو رزق اللہ تعالیٰ ہمیں دیتے ہیں، وہ دراصل صرف ہمارا نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ دوسرے سائل ومحروم بھی حصہ دار ہیں۔ اس مقصد سے ایسے لوگوں کے لیے اپنے مال میں سے کچھ حصہ ضرور مقرر کرنا چاہیے۔

دوسرا اصول نصرت دین کا ہے۔ جب دین کا وجود خطرے میں ہو، تو اس کی مدد کرنا لازم ہے۔ اس سلسلے میں اگر ضرورت مقتضی ہو، دین پر ابتلا ایسی شدید ہو کہ اپنی ضرورت سے بڑھ کر سب کچھ دینا پڑے تو دینا ہوگا۔ لوگ اسے نفلی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ لازم ہے۔

اسی اصول پر معاشرے، ملک اور قوم کی ابتلا میں مدد کرنا بھی حتی المقدور لازم ہے۔ ایسا کرنے سے انسان میں اوصاف حمیدہ وجود میں آتے ہیں، جن کے ذریعے سے انسان میں صبر پیدا ہوتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ ایسا ہی اثر رکھتا ہے جیسے نماز۔ سورۂ توبہ میں انفاق کو قرب الٰہی کا سبب قرار دیا گیا ہے (۹:۹۹) اسی طرح نماز کو قرب الٰہی کا سبب قرار دیا ہے۔ (العلق ۹۶:۱۹) اللہ سے یہ تعلق انسان میں نیکیوں کی طرف میلان اور برائیوں سے اجتناب کا وصف پیدا کرتا ہے۔ نیکی پر قائم رہنا اور برائیوں سے مجتنب رہنا ہی صبر ہے۔

مطالعۂ قرآن

قرآن مجید کا مطالعہ اسے سمجھ کر کرنا بھی حصول صبر کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ دل کی صفائی اور بصیرت افروزی میں سب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے بڑھ کر ہے۔اسی سے خدا کی صفات کا علم حاصل ہوتا اور اسی سے وہ نور بصیرت ملتا ہے، جس سے اگر ہم دنیا کو دیکھنے لگیں تو ہمیں صبر و استقامت کے حصول میں بہت رہنمائی ملے گی۔قرآن مجید میں تعلیم کتاب وحکمت اور تلاوت آیات کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ تزکیۂ نفس ہی وہ چیز ہے جس سے نیکیاں دلوں میں گھر کرتیں اور برائیاں رخصت ہوتی ہیں۔

روزانہ قرآن کا ایک اتنا حصہ، جس سے خدا کا کوئی پیغام حاصل ہوتا ہو، پڑھنا اپنے لیے لازم کر لینا چاہیے۔اسے کسی اچھی تفسیر کی روشنی میں نہ بھی سمجھا جائے تو قرآن مجید کی تکرار اور تصریف آیات سے اس کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور بات عام قاری کو بھی سمجھ آ جاتی ہے۔

اس میں بعض طالب علموں کو میں نے یہ مشورہ دیا کہ وہ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی تفسیر 'تدبر قرآن' اگر تین سے پانچ ماہ میں ختم کر سکیں تو انھیں قرآن کے مجموعی پیغامات کا قدرے بہتر فہم حاصل ہو گا۔جب انھوں نے ایسا کیا تو انھیں میں نے بھی اپنے نظریات اور رویوں میں مختلف محسوس کیا ہے، اس لیے کہ قرآن تربیت کرتا ہے۔

جو لوگ طالب علم نہیں ہیں اور اتنی مقدار میں نہیں پڑھ سکتے تو اگر وہ کوئی اچھا ترجمہ ہی دو تین ماہ میں پڑھ لیا کریں تو اس سے وہی نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، اگرچہ وہ آہستہ ہوں گے اور کئی دفعہ کے ایسے مطالعہ کے بعد حاصل ہوں گے۔آدمی اگر ترجمۂ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا معمول بنا لے اور ہر تین چار ماہ میں قرآن کا ترجمہ ختم کر لیا کرے تو خود اسے بھی ان حیرت انگیز اثرات کا احساس ہو گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس میں ترجمہ کوئی بھی لیا جا سکتا ہے، مگر فرقہ وارانہ تعصّبات کی بنا پر تراجم کے حواشی میں اور بعض اوقات تراجم کے وسط میں ایسے اضافے کر دیے جاتے ہیں کہ جس سے ترجمہ اپنا اصل رنگ کھو دیتا ہے۔اگر یہ ممکن ہو کہ کوئی ایسا ترجمہ جسے لکھنے والے کسی فرقے کے مبلغ و نمائندہ نہ ہوں تو وہ زیادہ بہتر ہے۔میرے خیال میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی رحمہ اللہ کا ترجمہ جو الگ بھی چھپ گیا ہے، وہ اس مقصد کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

لیکن اگر اس رفتار سے پڑھنا ممکن نہ ہو تو نہ پڑھنے سے بہتر ہے کہ آدمی اتنا پڑھے جو ہم نے سب سے پہلے ذکر کیا کہ جس سے روزانہ ایک پیغام سا آپ کو مل جائے۔

لوگوں نے قرآن کو جادوئی کلمات کی طرح سمجھ رکھا ہے، یعنی اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں، وہ اثر ضرور کرتا ہے۔یہ نظریہ غلط ہے۔قرآن ہدایت وضلالت کے قانون کے مطابق بس اتنا ہی فیض یاب کرتا ہے، جتنی ہماری آپ کی سعی ہو گی۔

[باقی]